حادثۂ افغانستان

اکتوبر ۳۳ء میں افغانستان کو جاتے ہوئے نومبر کیلئے جب میں شذرات قلمبند کر رہا تھا
تو یہ خیال نہ تھا کہ میری واپسی اسقدر جلد ہوگی، اور اسی طرح ۳۰، اکتوبر کی صبح کو کابل سے روانہ
ہوتے ہوئے یہ خیال بھی نہ تھا کہ ۸، نومبر ۳۳ء کی سہ پہر کو افغانستان میں یہ عظیم الشان واقعہ پیش آئیگا،
۳- نومبر کی رات کو غزنین و قندھار و چمن ہوکر میں اور ڈاکٹر سر اقبال کوئٹہ پہنچے، اور میں
وہاں میں دو روز ٹھہر کر ۸، کی دوپہر کو لکھنؤ پہنچا، اور ۹، کی صبح کو شاہ نادر خاں کی شہادت
کی وہ خبر سنی، جسکا وہم و گمان بھی نہ تھا،

افغانستان کی سرزمین ناگہانی سیاسی واقعات کے ظہور کے لیے ہمیشہ سے مشہور ہے، مگر آج
جب دشمن ہر قدم پر کمین میں ہیں، اس قسم کے واقعہ کا پیش آنا حد درجہ افسوسناک ہے، افسوس اشخاص
کی حیات و موت کا اتنا نہیں جتنا افغان قوم کی حیات و موت کا ہے،

ہمکو معلوم ہے کہ اسوقت ملک کی ترقی کیلئے وہاں کیا کیا تدابیر زیر غور تھیں، مگر افسوس کہ واقعات
نے اب نیا پہلو بدلا ہے، تاہم ہمکو امید ہے کہ موجودہ کار فرمایانِ حکومت کی دانشمندی سے مصیبت
کی وہ بلائیں افغانستان کے سر سے دور ہو جائینگی، جو اسوقت منڈلا رہی ہیں،

دعا ہے کہ شاہ شہید کو مغفرت اور ملک کو امن و امان نصیب ہو،

سید سلیمان، ندوی،

۱۳، نومبر ۱۹۳۳ء

جلد ۳۲	ماہ رجب المرجب ۱۳۵۲ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۳۳ء	عدد ۵

مضامین

شذرات

ناظرین یہ سنکر خوش ہونگے کہ اعلیحضرت فرمانروائے دکن خلد اللہ ملکہ کی سرکار عالی مقدار نے دار المصنفین کو یہ اعزاز بخشا ہے کہ اسکو اپنی ضرورت کے لیے فقہ حنفی کے رو سے ایک ضابطہ جنایات قتل و قصاص کی ترتیب و تدوین کا حکم دیا ہے، چنانچہ حکم والا کی تعمیل کیگئی، اور سابق دولت عثمانیہ کی مجلۃ الاحکام کی طرح، یہ قانون جنایات بھی دفعہ وار مستند کتب فقہ حنفی کے حوالون سے مرتب کیا گیا ہے، اب عنقریب اسکا مسودہ صاف ہوکر سرکار عالی کے ملاحظہ مین پیش ہوگا، اور اس کے بعد شاید منتخب مجلس علمار کے سپرد ہو، کہ وہ اس پر نظر ثانی کرے،

اعلیحضرت نادر خان شاہ افغانستان کے عہد مین جو تعلیمی و علمی ترقیان افغانستان مین روز افزون ہیں، اب ان کی ترتیب و تنظیم کی تجویز زیر غور ہے، اور ایک کابل یونیورسٹی کی تکمیل عمل مین آرہی ہے، اور ساتھ ہی تراجم و تالیفات کے دائرے بھی وجود مین آرہے ہین، اور غالبًا انھین امور مین مشورہ کی غرض سے ہندوستان سے چند اصحاب کو دار السلطنت آنے کی دعوت افغانستان کی حکومت کی طرف سے دی گئی ہے،

یہ تعلیمی و علمی دعوت ڈاکٹر سر اقبال، نواب سر راس مسعود وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، اور اڈیٹر معارف کو موصول ہوئی ہے، خدا کرے کہ اس علمی وفد سے اس دولت خداداد کی جسکا خداداد ہونا کئی دفعہ تاریخ مین ثابت ہوچکا ہے، کوئی مفید خدمت انجام پاسکے، اور جس طرح اس کا ملک خداداد ہے، اسکا علم و تمدن بھی خداداد ثابت ہوسکے،

یہ عجیب اتفاق ہے کہ راقم کی بعض اہم تصنیفات اس وقت شائع ہوئین، جب وہ ہندوستان سے باہر تھا،

سیرۃ عائشہؓ جب ۱۹۲۰ء مین شائع ہوئی تو لندن مین تھا، سیرۃ النبی کی دوسری جلد جب شائع ہوئی، تب بھی لندن مین تھا، چنانچہ اس کا مقدمہ بھی وہین بیٹھکر لکھا گیا ہے، سیرۃ النبی کی تیسری جلد جب چھپی ہے، تو مولف سلطان ابن سعود اور شریف علی کے محاذ جنگ یعنی جدہ مین تھا، اور اسکا مقدمہ وہین سے لکھکر ہندوستان بھیجا گیا، اب جب خیام کی اشاعت کی باری آرہی ہے، تو پھر جلا وطنی کے سامان ہین، کیا حسن اتفاق کے سوا ان دو واقعون مین کوئی منطقی ربط و لزوم بھی ہے؟

آجکل بعض جماعتون نے مسئلہ قضا کی تحریک اشاعت کی کوششین از سر نو شروع کی ہین، یہ حسن اقدام مبارک ہے، لیکن اس سے پہلے کہ اس کیلئے قدم اٹھایا جائے ضرورت اسکی ہے کہ مسلمان مجالس اور انجمنون کے اتحاد و تعاون کی طرف قدم اٹھایا جائے، حکومت صرف قومی قوت کو مانتی ہے، اور قوم مین قوت صرف اتحاد سے پیدا ہوسکتی ہے، ڈر ہے کہ اتنی اہم اور ضروری تحریک بھی ہمارے اختلافات باہمی کے نذر نہ ہو،

جہانتک اس تحریک کی تاریخ کا تعلق ہے یہ سب سے پہلے ۱۹۱۹ء مین معارف کے صفحات مین مانٹیگو چمسفورڈ اسکیم کے وقت پیش کیگئی اور اسکے بعد جمعیۃ العلمار کے خطبۂ صدارت کلکتہ اور جمعیۃ العلمار کی تجاویز اور معارف کے شذرات مین بار بار پیش کیجاتی رہی، یوپی گورنمنٹ نے ۱۹۲۶ء مین امر جٹس سلیمان کی صدارت مین بعض مسلمان ارکان کونسل اور بعض علمار کی مجلس اس غرض سے قائم کی تھی کہ نکاح و طلاق کے درج رجسٹر ہونے کے امکان پر غور کیا جائے اس مجلس نے متعدد نشستون مین اس کام کو انجام دیا، اور صوبہ کے اکثر ممتاز علما اور معززین کی شہادتین قلمبند کیگئین، اس کمیٹی کے ایک ممبر ڈاکٹر شفاعت احمد خان بھی تھے، علمار مین مولنا کفایت اللہ صاحب، مولنا قطب الدین عبد الوالی صاحب، مولنا نعیم الدین صاحب مرادآبادی اور یہ خاکسار اور بعض دوسرے اصحاب بھی تھے، اس سلسلہ مین کمیٹی کے ممبرون مین کچھ اختلافات تھے جنکی بنا پر ہم مین سے بعض اصحاب نے اپنا اختلافی نوٹ الگ پیش کیا تھا،

اختلافی نوٹ کی تحریر کی خدمت خاکسار کو سپرد ہوئی تھی، اور مولنا کفایت اللہ صاحب، مولنا قطب الدین عبد الوالی صاحب اور چودھری رشید الدین صاحب رئیس بارہ بنکی نے اسکی تائید فرمائی تھی، اس اختلافی نوٹ مین مسئلۂ قضا کی اہمیت و ضرورت اور

اس کے قیام کی تدابیر پر مدلل بحث تھی، یہ تحریر رپورٹ مین شامل ہو کر گورنمنٹ مین پیش ہوئی، مگر تعجب ہے کہ پھر ہمارے صوبہ کی گورنمنٹ نے اور کونسل نے بھی اس تحریک و تجویز کی خبر لی، ممکن ہوا تو آئندہ معارف مین ہم اس تحریر کو پیش کرنے کی کوشش کرینگے، تاکہ مسئلہ مذکور کے اکثر پہلو سامنے آجائین،

فلسطین مین ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کی تحریک سال دو سال سے چل رہی ہے، اور سید امین الحسینی مفتی اعظم فلسطین جو فلسطین کے اسلامی جسم کا دماغ اور روح ہین، وہ اس تجویز کو عمل مین لانے کیلئے پوری طرح منہمک ہین، اور کئی مہینون سے ہندوستان کا دورہ فرما رہے ہین، موصوف سے ہمکو تو اسلامی کانفرنس کے زمانہ سے ذاتی تعارف حاصل ہے، اور انکے اخلاص اور دردِ ملت مین ذرہ برابر بھی شک نہین لیکن انکی خدمت مین صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ہندوستان مین انگریزی سلطنت کے استیلاء کے بعد مسلمانون کو ایک اسلامی یونیورسٹی کے تخیل مین ہر ملکی ضرورت اور سیاسی تنظیم سے الگ تعلیم کے وادی تیہ مین چالیس برس تک سرگردان رکھا گیا، کہین تاریخ کا اعادہ اسی طرح بنی اسرائیل کے بدلہ مسلمانانِ فلسطین کو تو (جو اب ہماری ہی طرح انگریزی تحت و قبضہ مین ہین) ہر طرف سے موڑ کر اس وادی مین نہین لے چل رہا ہے، فتنبہ،

مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کے گذشتہ اجلاس مین ایک تجویز یہ بھی پیش ہوئی تھی کہ اس یونیورسٹی کے کالجون مین لڑکون اور لڑکیون کی مخلوط تعلیم کی اجازت دیجائے، وائس چانسلر صاحب کی تحریک سے یہ تجویز علمی مجلس کے سپرد کردیگئی ہے کہ وہ اسکا مناسب فیصلہ کرے، وہ فیصلہ کیا ہوگا اس کی خبر نہین،

اس موقع پر یہ گذارش بیجا نہ ہوگی کہ ہم اپنے طور و طریق اور طرز تمدن کو خیرباد کہکر جن قومون کی ریس کرنا چاہتے ہین پہلے انھین سے پوچھنا چاہئے کہ آیا وہ اسکو اپنے تمدن کے حق مین زندگی سمجھ رہی ہین یا موت، بہرحال جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہیگا، تاہم ہماری چیخ پکار اگر سنگدل کو رحم دل نہین بنا سکتی ہے تو تب بھی جبتک جسم مین زندگی ہے چوٹ لگنے پر دل سے آہ! تو ایکدفعہ نکل ہی جائیگی،

خوشی کی بات ہے کہ مسلم یونیورسٹی نے اردو امتحانات اور ڈگریون کے مسئلہ مین ایک قدم آگے بڑھایا ہے، ایکدن یہ حقیقت بھی تسلیم کرلیجائے گی کہ اردو زبان بھی دوسری زبانون کی طرح یہ حق رکھتی ہے کہ اسکو بھی اعلیٰ معیاری امتحانون مین جگہ دیجائے،

مقالات

قاضی ابویوسف

(بسلسلۂ تبصرۂ تاریخ خطیب بغدادی)

یعقوب بن ابراہیم ابویوسف القاضی شاگرد ابوحنیفہ، نسب یہ ہے، ابویوسف یعقوب بن ابراہیم بن حبیب بن سعد بحیر بن المعاویہ الانصاری (حضرت سعدؓ صحابی ہین، اون کی ماں حبتہ صحابیہ، سعد احد کے دن (حضرت) رافع بن خدیجؓ اور حضرت ابن عمرؓ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ملاحظہ مین پیش ہوئے، کم سنی کی وجہ سے بھرتی نہین ہوئے

تحصیل علم | ابویوسف ۱۱۳ھ مین پیدا ہوئے، گھر مفلس تھا، حدیث اور فقہ کی تحصیل کا شوق تھا، حدیث کی روایت منجملہ دیگر مشائخ کے یحییٰ بن سعید الانصاری، سلیمان الاعمش، ہشام بن عروہ، عطار بن السائب لیث بن سعد سے کی، محمد بن حسن احمد بن حنبل یحییٰ بن معین وغیرہم نے ان سے روایت کی، بغداد مین سکونت اختیار کرلی تھی،

ایک دن ابوحنیفہ کی محفل مین بیٹھے تھے کہ انکے والد وہان پہنچے باپ کے ساتھ ہولئے، باپ نے کہا کہ ابوحنیفہ کے قدم پر قدم مت رکھو، ان کو تو پکی پکائی ملتی ہے، تمھین پیٹ پالنے کی ضرورت ہے، انھون نے یہ سُنکر طلب علم مین کمی کردی، ان کا بیان ہے کہ ابوحنیفہ نے میری جستجو کی، بیٹھ رہنے کے بعد پہلی بار مین ان کے پاس پہنچا تو پوچھا آنا کیون چھوڑ دیا

لہ ہشام بن عروہ ابو اسحٰق شیبانی عطار بن السائب اور انکے طبقے سے سماع حدیث کیا اکبر شیوخ حصین بن عبدالرحمٰن ہین، ان سے محمد بن حسن احمد بن حنبل، بشر بن الولید یحییٰ بن معین اور اور بہت لوگون نے سماعت حدیث کی،

یحییٰ بن معین کا قول ہے، ابویوسف صاحب حدیث و صاحب سنت تھے، (امام) احمد کا قول ہے ابویوسف حدیث مین صاحبِ انصاف تھے، ذہبی کا قول ہے کہ مین نے ابویوسف اور محمد بن حسن کے حالات علیحدہ کتابون مین لکھے ہین، (تذکرۃ الحفاظ للذہبی)

مین نے کہا کہ پیٹ کی فکر اور باپ کی فرمانبرداری کی وجہ سے، یہ کہکر مین بیٹھ گیا، آدمی چلے گئے، تو ایک تھیلی مجھ کو دی اور کہا اس کو خرچ کرو، جب ختم ہوجائے تو اطلاع کرنا، پڑھنا مت چھوڑو، مین نے دیکھا تو سَو درم تھے اب مین نے پابندی سے پڑھنا شروع کیا، چند روز کے بعد سَو درم اور عنایت ہوے، حالانکہ مین نے اشارۃً بھی ختم ہونے کا ذکر نہین کیا تھا، اسی طرح بے طلب عنایت ہوتی رہی، یہانتک کہ مین آسودہ حال ہوگیا، ایک روایت کے بموجب باپ نے چھوٹا چھوڑا تھا، مان درس سے اٹھالی جاتی تھین، ایک روز ابوحنیفہ نے اون سے کہا، نیک بخت! جا علم سیکھ کر فالودہ روغن پستہ کے ساتھ کھائے گا، یہ سنکر وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئین، جب قاضی القضاۃ ہوگئے تو ایک بار خلیفہ ہارون رشید کے دسترخوان پر فالودہ پیش ہوا، خلیفہ نے اون سے کہا، یہ کھاؤ، یہ روز روز نہین تیار ہوتا ہے پوچھا، امیرالمومنین کیا ہے، کہا فالودہ اور روغن پستہ، یہ سنکر ابو یوسف ہنس پڑے، خلیفہ نے پوچھا، کیون ہنسے، کہا بخیر، امیرالمومنین کو اللہ تعالیٰ زندہ وسلامت رکھے، ہارون الرشید نے اصرار کیا تو اونھون نے واقعۂ بالا بیان کیا، سنکر خلیفہ کو حیرت ہوئی اور کہا علم دین و دنیا مین عزت دیتا ہے، اللہ تعالیٰ ابو حنیفہ پر رحمت فرمائے، وہ عقل کی آنکھون سے وہ کچھ دیکھتے تھے جو ظاہری آنکھون سے نظر نہین آتا،

امام اعظم کی صحبت مین

سترہ برس تک ابوحنیفہ کی صحبت مین حاضر رہے ایک بار اس زمانہ مین سخت بیمار ہوگئے، امام صاحب نے آکر دیکھا تو واپسی مین اُن کے دروازے پر متفکر کھڑے ہوگئے، کسی نے سبب پوچھا، تو کہا یہ جوان مرگیا تو زمین کا سب سے بڑا عالم اٹھ جائے گا،

ابو یوسف کا قول ہے کہ دنیا مین کوئی چیز مجھکو ابو حنیفہ اور ابن ابی لیلی کی مجلس سے زیادہ محبوب نہ تھی ابو حنیفہ سے بڑھکر فقیہ اور ابن ابی لیلی سے اچھا قاضی مین نے نہین دیکھا،

خطیب کا قول ہے کہ ابو حنیفہ کے شاگردون مین دو شاگرد سب سے زیادہ ممتاز تھے، ابو یوسف اور زفر، عمار کا قول ہے کہ ابو حنیفہ کے شاگردون مین ابو یوسف کی مثال نہ تھی، اگر وہ نہوتے تو نہ کوئی ابو حنیفہ کو جانتا، نہ ابن ابی لیلی کو، وہی تھے جنھون نے ان کا علم پھیلایا، اور اون کے اقوال کو دور دور پہنچایا، طلحہ کا قول ہے، ابو یوسف کی شان

مشہور، علم وفضل بلند تھا، ابو حنیفہ کے شاگرد تھے، فقہ مین اپنے معاصرین مین سب سے بڑھکر، اون سے بڑھکر اون کے زمانے مین کوئی نہ تھا، علم وحکمت وریاست وقدر مین انتہا کو پہنچے ہوے تھے، وہ پہلے شخص ہین جنھون نے ابو حنیفہ کا علم زمین کے کنارون تک پہنچا دیا، اصول فقہ کی کتابین لکھین، مسائل کا نشر املاکے ذریعے سے کیا،

ایک بار اعمش نے اون سے ایک مسئلہ دریافت کیا، جواب سنکر کہا، یہ کہان سے کہتے ہو، کہا فلان حدیث سے جو آپ سے روایت کی ہے، اعمش نے ہنسکر کہا کہ یہ حدیث مجھ کو اس وقت سے یاد ہے، کہ تمھارے باپ کی شادی بھی نہ ہوئی تھی، معنی اوس کے آج معلوم ہوئے،

امام مزنی سے کسی نے اہل عراق کی بابت پوچھا، ابو حنیفہ کی بابت کہا "سیدہم" اون کے سردار، ابو یوسف کی بابت کہا اتبعہم للحدیث ان مین سب سے زیادہ حدیث کے پیرو، محمد بن حسن سب سے زیادہ مسائل اخذ کرنے والے، زفر سب سے زیادہ قیاس مین تیز،

ہلال بن یحیی کا قول ہے، کہ ابو یوسف تفسیر، مغازی، ایام عرب کے حافظ تھے، فقہ ان کے علوم مین اقل العلوم تھی،

ایک بار ابو حنیفہ کے سامنے ابو یوسف اور زفر نے کسی مسئلے پر بحث کی، ظہر تک جاری رہی، اور ایک دوسرے کی دلیل کو رد کرتا رہا، ظہر کے وقت ابو حنیفہ نے زفر کی ران پر ہاتھ مار کر کہا، جس شہر مین ابو یوسف ہون، اوس کی ریاست کی ہوس مت کرو،

ایک بار ابو حنیفہ نے اپنے شاگردون کی بابت کہا، یہ چھتیس مرد ہین، اون مین سے اٹھارہ عہدۂ قضا، کی اہلیت رکھتے ہین، چھ فتوی دینے کی، دو ایسے ہین جو قاضیون کو پڑھا سکتے ہین، یہ کہکر ابو یوسف اور زفر کی طرف اشارہ کیا،

ایک بار ابو حنیفہ (جو فراست مین ممتاز تھے،) نے داؤد طائی سے کہا کہ تم عبادت کے ہو رہوگے، ابو یوسف سے کہا، تم دنیا کی طرف مائل ہوگے، اسی طرح زفر وغیرہ کی نسبت رائے ظاہر کی، جو کہا تھا، واقعات نے وہی ثابت کیا،

لطیفہ:۔ ایک شخص ابو یوسف کی صحبت مین خاموش بیٹھے رہتے تھے ایک بار اونھون نے کہا تم بولتے کیون نہین کہا بہت اچھا، روزہ کب افطار کرنا چاہئے، کہا جب آفتاب غروب ہو، بولے، اگر آفتاب آدھی رات تک غائب نہو تو یہ سُنکر ابو یوسف ہنس پڑے، اور کہا تمھارا خاموش رہنا ہی اچھا تھا، تمھاری زبان کھلوا کر مین نے خطا کی،

عہدہ قضا — خلیفہ ہادی نے سنہ ۱۶۶ھ مین بغداد کا قاضی مقرر کیا، ہارون الرشید نے اپنی خلافت مین بحال رکھا اسلام مین وہ اول شخص ہین، جو قاضی القضاۃ ہوے، سترہ برس تک قاضی القضاۃ رہے[1]

اُن کے قاضی ہونے کے عہد مین ایک بار امیر المومنین ہادی کے ایک باغ پر کسی نے اُن کی عدالت مین دعویٰ کیا، بظاہر خلیفہ کا پہلو زبردست تھا، گرواقعہ اوس کے خلاف تھا، امیر المومنین نے کسی موقع پر اُن سے پوچھا، کہ تم نے اوس باغ کے معاملے مین کیا کیا، جواب دیا، مدّعی کی درخواست یہ ہے، کہ امیر المومنین کی حلفیہ شہادت اس پر لیجائے کہ اون کے گواہون کا بیان سچا ہے، ہادی نے پوچھا کیا اون کی یہ درخواست واجبی ہے، جواب دیا کہ ابن ابی لیلی کے فیصلے کے مطابق صحیح ہے، خلیفہ نے کہا اس صورت مین باغ مدّعی کو دلا دو، یہ ابو یوسف کی ایک تدبیر تھی،

وفات — در ربیع الاوّل یا ربیع الآخر باختلاف قولین سنہ ۱۸۲ھ مین انتقال کیا، انتقال کے وقت انہتّر برس کی عمر تھی،

وفات کے وقت کہا، کاش مین اوس فقر کی حالت مین مرتا، جو شروع مین تھی، اور قضاء کے کام مین نہ پھنستا، خدا کا شکر ہے اور اسکی یہ نعمت ہے کہ مین نے قصداً کسی پر ظلم نہین کیا، اور نہ ایک فریق معاملے کی، دوسرے کے مقابلے مین پروا کی، خواہ وہ بادشاہ تھا یا بازاری، وفات کے وقت یہ قول بھی منقول ہے، بار الہا! تو خوب جانتا ہے، کہ مین نے کسی فیصلے مین جو تیرے بندون کے درمیان کیا خود رائی سے کام نہین لیا، تیری کتاب اور تیرے رسول کی سنت کی پیروی کی کوشش کی، جہان مجھکو اشکال پیش آیا، ابو حنیفہ کو اپنے اور تیرے درمیان

[1] ابن عبد البر کا قول ہے، میرے علم مین کوئی ایسا قاضی سوائے ابو یوسف کے نہین، جس کا حکم مشرق سے مغرب تک سارے آفاق مین روان رہا ہو، شذرات الذہب لابن عماد الحنبلی،

مین واسطہ کیا، اور واللہ وہ میرے نزدیک اون لوگون مین سے تھے، جو تیرے حکم کو پہچانتے تھے، اور کبھی جانکر حق کے دائرے سے نہین نکلتے تھے، یہ بھی موت کے وقت ان کی زبان پر تھا، بار الہا! تو جانتا ہے کہ مین نے جانکر حرام نہین کیا اور نہ جانکر کوئی درم حرام کا کھایا،

اون کی علالت کے دوران مین معروف کرخی نے اپنے ایک رفیق سے کہا کہ مین نے سُنا ہے، ابو یوسف زیادہ علیل ہین، تم اون کی وفات کی خبر مجھکو دینا، راوی کا بیان ہے کہ مین دار الرقیق کے دروازہ پر پہنچا، تو ابو یوسف کا جنازہ نکل رہا تھا، دل مین کہا کہ اب معروف کرخی کو خبر کرنے جاتا ہون تو نماز جنازہ نہ ملیگی، چنانچہ نماز مین شریک ہو کر اون کے پاس پہنچا اور خبرِ وفات سنائی، اون کو سخت صدمہ ہوا، بار بار انا للہ پڑھتے تھے، مین نے کہا یا ابا محفوظ! آپ کو نمازِ جنازہ مین شریک نہ ہونے کا اس قدر صدمہ کیون ہے، کہا مین نے خواب مین دیکھا کہ مین جنت مین داخل ہوا ہون دیکھتا ہون کہ ایک محل تیار ہوا ہے، اس کا بالائی حصّہ مکمل ہو چکا، پردے آویزان کر دیے گئے، غرض ہر طرح پورا ہو چکا مین نے پوچھا یہ کس کے لئے تیار ہوا ہے، لوگون نے کہا ابو یوسف کے واسطے، مین نے کہا یہ مرتبہ اونھون نے کیون کر پایا، جواب ملا اچھی تعلیم دینے اور اوس کے شوق کے صلے مین اور لوگون نے جو اذیت پہنچائی اوس کے صلے مین،

شجاع بن مخلد کا قول ہے کہ ہم ابو یوسف کے جنازے مین شریک ہوئے، عباد بن العوام بھی ہمارے ساتھ تھے، مین نے اون کو یہ کہتے سُنا، کہ اہلِ اسلام کو چاہئے کہ ابو یوسف کی وفات پر ایک دوسرے کے ساتھ تعزیت کرین[1]

[1] خلیفہ ہارون الرشید جنازہ کے آگے آگے چلتے تھے نماز جنازہ خود اونھون نے پڑھائی، مقابر قریش مین ام جعفر زبیدہ کی قبر کے پاس دفن کیا، محمد بن جعفر کا قول ہے، ابو یوسف کی شان مشہور فضل ظاہر تھا، اپنے زمانے مین سب سے زیادہ فقیہ تھے، اون سے بڑھ کر کوئی نہ تھا، علم، حلم، ریاست، قدر و جلالت مین انتہا کو پہنچے ہوئے تھے، العبر مین لکھا ہے، ابو یوسف جواد اور سخی تھے ابو حاتم کا قول ہے، ان کی حدیث لکھی جائے انتہیٰ ابن اہدل کا قول ہے کہ اکثر علما، ابو یوسف کی فضیلت و عظمت کے قائل ہین ابن عبد البر کا قول ہے، ابو یوسف فقیہ عالم حافظ تھے کثیر الحدیث ۱۲ شذرات الذہب لابن عماد الحنبلی، ج،

وفات سے پہلے کہتے تھے کہ سترہ برس ابو حنیفہ کی صحبت مین رہا، سترہ برس دنیا کے کام مین رہ چکا، میرا گمان ہے کہ اب میری موت قریب ہے، اس قول کے چند مہینے کے بعد وفات پائی،

ان کے بیٹے یوسف غربی بغداد کے قاضی تھے،

مناقب وجرح ابن کامل کا قول ہے کہ یحییٰ بن معین، احمد بن حنبل، اور علی مدینی اون کے ثقہ فی النقل ہونے پر متفق ہین یحییٰ بن معین کا قول ہے، کہ ابو یوسف اصحاب حدیث کی جانب مائل تھے، اور اون کو دوست رکھتے تھے اور مین نے اون سے حدیثین لکھی ہین، امام احمد بن حنبل کا قول ہے، کہ حدیث مین میرے پہلے استاد ابو یوسف ہین، اون کے بعد مین نے اوروں سے حدیث لکھی، ابن مدینی کا قول ہے، کہ ابو یوسف صدوق تھے،

خطیب بغدادی نے اپنا مورخانہ فرض امام ابو یوسف کے حالات مین بھی جرح کے متعلق ادا کیا ہی، اور متواتر روایتین جرح کی نقل کی ہین، اسی کے ساتھ اثنائے بیان مین بعض جرحون کا جواب بھی دیا ہے، جرح سب کی سب غیر مفسر اور غیر مبین السبب ہین، مواد جرح وہی ہے، جو امام اعظم اور امام محمدؒ کی نسبت جرحون کا ہے، یعنی مرجئی ہونا وغیر ذلک، مذکور الصدر دونون اماموں کے ذکر مین اس پر جو بحث مجمل ومفصل ہو چکی وہی یہان بھی کی جا سکتی ہے، اعادہ تحصیل حاصل، یا لا حاصل، متاخرین ائمۂ رجال نے امام ابو یوسف کے متعلق بھی جرح متروک کر دی ہے، صرف مناقب وتعدیل لکھی ہے،

مثلاً دیکھو تذکرۃ الحفاظ امام ذہبیؒ، اور شذرات الذہب ابن عماد الحنبلیؒ،

متقدمین مین سے امام ابن قتیبہ نے معارف مین نہ امام اعظم پر جرح کی ہے اور نہ ابو یوسف پر، حالانکہ دوسرے رجال پر جرح کرتے ہین،

سیرۃ النعمان

امام ابو حنیفہ کی سوانحعمری اور اون کے اجتہادات اور مسائل فقہ حنفی کی تاریخ اور اسکی تدوین کے حالات فقہ حنفی کی خصوصیات علم حدیث، علم فقہ کی تاریخ، اور اسلامی قانون پر تبصرہ ۴۲۵ صفحے، قیمت عہ/،

"منیجر"

نفسیات حکیم ناصر خسرو

(۲)

از

پروفیسر معتضد ولی الرحمن ایم اے، استاد نفسیات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن،

(۵)

یہ نفس جس کی تعریف کی کوشش ادھر کی گئی ہے، تین مدارج مین پایا جاتا ہے، اول نفس نباتی دوم نفس حیوانی، اور سوم نفس ناطقہ[1]، نفس نباتی مین غذا حاصل کرنے، اپنی نسل کی افزائش کرنے، اور اپنے ہی طرح کے نیچے پیدا کرنے کی قوتین ودیعت کی گئی ہین، بلکہ کہنا چاہئے کہ ان ہی تین قوتون کے مجموعے کو نفس نباتی کہتے ہین، نفس حیوانی حیوانات مین ہوتا ہی، اس مین محسوسات کے اخذ کرنے، صورتون کا تخیل کرنے، اور خود اپنے اختیار سے حرکت کرنے کی قوتین ہوتی ہین، ان تینون قوتون کے مجموعے کو نفس حیوانی کہا جاتا ہے، نفس ناطقہ کی وجہ سے اجسام انسانی مین نطق، تدبیر، احتراز، تمیز وغیرہ کی قوتین پیدا ہوتی ہین، یہ قوتین انسان کیلئے مخصوص ہین، ان کے مجموعے کو نفس ناطقہ کہتے ہین، ان نفوس مین سے ہر ایک نفس مین تولید بالمثل کی قوت ہوتی ہے، اس کے علاوہ آخری نفوس مین اپنی مخصوص قوتون کے علاوہ، ماقبل کے نفس کی قوتین بھی ہوتی ہین، چنانچہ نفس حیوانی مین محسوسات کو اخذ کرنے وغیرہ کی قوتون کے علاوہ نفس نباتی کی بھی تمام قوتین ہوتی ہین، اسی طرح نفس ناطقہ مین اپنی مخصوص قوتون کے علاوہ نفس حیوانی کی تمام قوتین بھی ہوتی ہین، یعنی یہ کہ نفس ناطقہ نفس کی تمام امکانی قوتون کا حامل ہوتا ہی، اب ہم ان مین سے ہر ایک پر علحدہ علحدہ غور کرین گے،

[1] ان کو حکیم ناصر خسرو نے علی الترتیب نامی، حسی اور ناطقہ بھی کہا ہے، دیکھو ص ۲۲۹، ۵۲ زاد المسافرین ص ۲۹۰، ص ۱۹۱،

جو مزاج کہ گرمی، سردی، خشکی و تری کی وجہ سے اجسام انسانی میں پیدا ہوتا ہے، وہ نفس نباتی کے لئے بمنزلہ بنیاد و ہیولیٰ کے ہے، اور تمام قوائے نباتی یعنی غذا کا حاصل کرنا افزائش نسل، اور تولید بالمثل، اجرام فلکی کی تاثیر کا نتیجہ ہیں، ثبوت اس کا یہ ہے کہ یہ قوتیں جو اس مزاج میں ہوتی ہیں، کلیات یعنی ارکان چہارگانہ میں موجود نہیں، لہذا یہ کلیات سے نہیں، بلکہ کسی اور چیز سے حاصل ہوتی ہیں، اب اجرام علوی کے علاوہ کوئی اور ایسی چیز نہیں کہ جس کے آثار اور جس کی قوتیں ان طبائع کلیات تک پہنچی ہوں، اور جن کا رخ ان کی طرف ہو، یہی اجرام ہیں، جو اجسام سفلی کو محیط ہیں، اور جو اپنی قوتوں کو نیچے کی طرف ان تک ایصال کرتے رہتے ہیں، چنانچہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے، کہ سورج کی شعاعیں اور گرمی زمین تک پہنچتی ہیں، ان ہی اجرام علوی کی حرکت کا ثبات مذکورۂ بالا تینوں قوائے نباتی کے ہم معنی ہے، اور خود یہ حرکت غیر محسوس اور جسم کو حرکت دینے والی ہے، لہذا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ان تین قوتوں کا وجود اجرام علوی اور اجرام سفلی میں ان اجرام علوی کی حرکات کا نتیجہ ہے، یہاں ایک اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اگر کلیات طبائع اس تاثیر کو قبول کر لیتے، تو تمام طبائع نباتی ہو جاتے، کیونکہ اگر ایک چیز الف کا ایک جزو، دوسری چیز ب کے ایک جزو کو قبول کر لیتا ہے، تو کل چیز الف کل چیز ب کو قبول کر لیتی ہے، لیکن معترض نے شاید اس بات پر غور نہیں کیا کہ احاطۂ افلاک اور اجرام علوی دونوں "معدن لطائف" ہیں، اور اجرام سفلی پر ان کا اثر ہوتا ہے، لہذا ضروری ہے کہ ان میں کوئی ایسی قوت ہو، جو ان تمام اجسام تک پہنچے، نہ ایسی جو بعض تک تو پہنچے اور بعض تک نہ پہنچے، "مدبر حکیم" اور "صانع علیم" نے ان اجسام کو نکاتہائے معلوم میں ایک خاص ترتیب سے مرتب کیا ہے، اور ان ہی کی وساطت سے ان میں سے ایک کو دوسرے کے ساتھ ملایا ہے، اجرام علوی سے آنے والے اثرات اس مزاج کی تلاش کرتے ہیں، جو عدل سے حاصل ہوا ہے، اور مزاج کی قابلیت قبول کے مطابق اس کے ساتھ پیوست ہو جاتے ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ اس مزاج کے بعض حصوں کے ساتھ تو یہ اثرات پیوست ہوں، اور بعض کے ساتھ نہ ہوں، کیونکہ اگر یہ اثرات ایک جزو کے ساتھ پیوست ہوں، اور دوسرے کے ساتھ نہ ہوں، تو جب یہ اجزا ایک ترکیب میں جمع ہوتے ہیں، تو مقدم الذکر جزو مؤخر الذکر جزو پر ظلم کرتا ہے اور یہ صانع حکیم کے عدل کے منافی ہے، پھر اگر کسی مزاج کے اجزائے طبائع متکافی نہیں ہوتے، تو روح (جو عنایت الٰہی

کا اثر ہے) اس کے ساتھ پیوست نہیں ہوتی، کیونکہ یہ روا نہیں کہ عدل و اثر و عنایت الٰہی سے کوئی چیز ان طبائع کے ساتھ پیوست ہونے کے لئے مرکز عالم کی طرف آئے، اور ایک چیز دوسری کے مقابلے میں زیادہ حصہ حاصل کرے اور اس کو حاصل کرنے میں ایک دوسری پر ستم کرے، اس کے علاوہ جب کسی مزاج کے اجزائے طبائع متکافی نہیں ہوتے، تو قوی ضعیف پر ستم کرتا ہے، لہذا اس ستم کی وجہ سے عنایت الٰہی اس کے ساتھ پیوست نہیں ہوتی، لہذا ثابت ہوا کہ مزاج اس طبائع (جو انسان کے جسم کے لئے بنایا گیا ہے) کے اندر روح نباتی اجرام علوی سے آتی ہے، اور یہی مزاج اس روح کیلئے بمنزلہ بنیاد و ہیولیٰ کے ہے[1]، یہ بھی دکھایا جا چکا ہے کہ جب مزاج معتدل نہیں ہوتا، تو روح اس کے ساتھ کیوں پیوست نہیں ہوتی، روح نباتی[2]، جس کو یہ تینوں قوتیں حاصل ہیں، اس مزاج کو ہیکل مردم کے بنانے کے لئے پیدا کرتی ہے، اور یہی روح نباتی روح حیوانی کے لئے بمنزلہ بنیاد و ہیولیٰ کے ہو جاتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ روح حیوانی میں بھی روح نباتی کے ذریعہ اجرام علوی کی تاثیر سے یہ خاص مزاج پیدا ہوتا ہے، یعنی یہ کہ روح نباتی روح حیوانی میں حس، خیال، اور خود اپنی مرضی کے مطابق حرکت کا باعث ہوتی، اور روح حسی کہلاتی ہے[3]،

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ مزاج میں روح حیوانی کے پیدا ہو جانے کے بعد یہ روح حیوانی روح ناطقہ کیلئے موزوں بنتی ہے، یا نہیں، اور یہ کہ اس مزاج میں روح ناطقہ کی پیدائش بھی اجرام فلکی کی تاثیر سے ہوتی ہے یا نہیں، پھر ایک اور دریافت طلب امر یہ بھی ہے، کہ ایک ایسے مزاج میں جو ہیکل مردم کی اصل ہے، ان تینوں ارواح میں سے ہر ایک ایک خاص نسبت میں پائی جاتی ہے، یا ہیکل مردم میں روح ناطقہ کے پیدا ہونے کا حال روح نباتی اور روح حیوانی کے پیدا ہونے کے حال سے مختلف ہے، اصلیت یہ ہے کہ روح نباتی اور روح حیوانی، دونوں غذا حاصل کرنے، اپنی افزائش کرنے، اور خود اپنے نسل کو پیدا کرنے کے لحاظ سے تو ایک دوسرے کے مشابہ ہیں، لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ روح حیوانی میں حرکت انتقال ہوتی ہے، یہ اپنے دشمن کو پہچانتی ہے

[1] حکیم ناصر خسرو کا یہ تمام استدلال صاف نہیں، [2] آیندہ ہر جگہ خیال رکھنا چاہیے کہ ناصر خسرو کے ہاں الفاظ "روح" اور "نفس" مترادفات ہیں، لہذا کہیں وہ لفظ روح استعمال کرتا ہے اور کہیں نفس [3] زاد المسافرین ص ۲۹۱، ۲۹۳، [4] ایضاً ص ۲۹۳، ۲۹۴،

اور اپنی غذا سے لذت حاصل کرتی ہے، روح نباتی میں یہ باتیں نہیں ہوتیں۔[1]

اوپر کے بیان سے یہ خیال پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، کہ روح نباتی اور روح حیوانی میں ایک فرق اور بھی ہے جس کو ہم نے فراموش کر دیا ہو، یعنی یہ کہ حیوان تناسل و توالد کے لئے مخالف جنس کے فرد کا محتاج ہوتا ہے اور نباتات میں یہ بات نہیں ہوتی، لیکن یہ خیال غلط ہے، واقعہ یہ ہے کہ نباتات کی یہ خصوصیت حیوانات کے مقابلے میں استوار تر اور درست تر ہوتی ہے، چنانچہ دانوں میں سے بعض نر ہوتے ہیں، اور بعض مادہ، درخت صرف اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب نر و مادہ ملتے ہیں، پھر اگر ایک خاص نر اور ایک خاص مادہ کو ملایا جائے، اور اس کے بعد پھر ان کو الگ الگ کر کے دوسری مادہ یا دوسرے نر کے ساتھ ملا دیا جائے، تو کوئی درخت پیدا نہیں ہوتا، یعنی یہ کہ نباتات کی حالت یہ ہے کہ کوئی دانہ اپنے جفت کو نہیں بدلتا، اگر یہ بدل دیا جاتا ہے، تو کوئی درخت پیدا ہی نہیں ہوتا، برخلاف اس کے حیوانات کا حال یہ ہے، کہ ان کا نر ایک مادہ کو چھوڑ کر دوسری سے ملاپ پیدا کرتا ہے، اور پھر بھی توالد و تناسل کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اسی واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ روح نباتی کی قوت سے جو خاصیت جفت پکڑنے کی دانوں میں ہوتی ہے، وہ اس خاصیت کے مقابلے میں مستقل تر ہوتی ہے، جو روح حسی کی وجہ سے حیوانات میں ہوا کرتی ہے۔[2]

لیکن روح حیوانی اور روح ناطقہ میں فرق یہ ہے کہ روح ناطقہ خود اپنے جسم کی مشارکت کے بغیر حرکت کر سکتی ہے، اور روح حیوانی میں مشارکت جسم کے بغیر کوئی حرکت نہیں ہو سکتی، چنانچہ حیوانات تناسل کی غرض سے طلب جفت میں پھرتے ہیں، اپنے دشمنوں سے بھاگتے ہیں، مختلف مقامات میں اپنی غذا تلاش کرتے ہیں وغیرہ، اس کے مقابلے میں نفس ناطقہ میں ان تمام حرکات کے علاوہ وہ حرکات بھی ہوتی ہیں جن میں جسم کی مشارکت کی ضرورت نہیں پڑتی، یہ نفس اپنے طبعی قویٰ کی مخالفت کرتا ہے، مثلاً یہ اپنی قوت شہوانی کو دباتا ہے، اپنے غصے کو روکتا ہے، اپنی بھوک کو مارتا ہے، اور دیگر اخلاق ناپسندیدہ سے باز رہتا ہے، اس طرح اس کے قوائے طبعی حد اعتدال سے آگے نہیں بڑھتے، پھر بعض وقت یہ جسم سے بالکل آزاد ہو جاتا ہے، چنانچہ یہ قیاسی مقدمات قائم کرتا ہے، اور اس سے نتائج

[1] زاد المسافرین ص۲۹۳، ۲۹۴، [2] ایضاً ص۲۹۴، ص۲۹۵،

برآمد کرتا ہو اور ان نتائج کو نئے قیاسات کے مقدمات بناتا ہو اسکا مطلب ہو جاتا ہو کہ نفس ناطقہ فاعل بھی ہو اور منفعل بھی اور سوال ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے[3]

جواباً کہا جا سکتا ہے کہ نفس ناطقہ فاعل تو اس لحاظ سے ہو کہ یہ بدیہیات عقل[4] سے مقدمات وضع کرتا ہے، چنانچہ یہ کہتا ہو کہ ہر جسم مکان گیر ہوتا ہے، اور ہر مکان گیر حرکت پذیر ہوتا ہے، ان دونوں مقدمات سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے، کہ کوئی جسم حرکت دینے والا نہیں ہو سکتا، یعنی یہ کہ جسم کو حرکت دینے والی چیز مکان گیر نہیں ہو سکتی، اور چونکہ یہ مکان گیر نہیں لہذا یہ جسم نہیں، اس طرح اس فعل میں یہ خود اپنا مفعول بن جاتا ہے، اتنی ہی مختصر گفتگو سے معلوم ہو جاتا ہو کہ ہر چند نفس نباتی و نفس حیوانی حرکت دینے پر قدرت رکھتے ہیں، لیکن ان کا حرکت دینا ویسا نہیں، جیسا کہ جسم کا حرکت دینا ہے، اسی سے واضح ہو جاتا ہو کہ نفس ناطقہ میں ایک قوت ایسی ہے کہ جس سے یہ جسم کو بھی حرکت دیتا ہے، اور خود اپنے آپ کو بھی یہ نفس حیوانی کو خشم، شہوت، حسد وغیرہ سے روکتا ہے اور یہی وہ قوتیں ہیں، جو نفس حیوانی کو حرکت دیتی ہیں۔[5]

اب مقدمات قیاسی سے نتائج حاصل کرنے میں جو حرکت نفس ناطقہ خود اپنے آپ کو دیتا ہے وہ قوت عقل کے ذریعہ ہوتی ہے، لہذا کہا جا سکتا ہے کہ نفس ناطقہ کی قوت جنبانندہ بے نہایت ہوتی ہے، یہ اس لحاظ سے نہیں کہ یہ آرام نہیں کرتا، اور اکتساب مقدمات اور استخراج نتائج میں ہمیشہ مصروف رہتا ہے، بلکہ اس حیثیت سے کہ یہ ان اعراض و حرکات کو قبول کرنے میں نہیں تھکتا، جو اس کے لائق ہیں، اسی قبول کرنے کو علم کہتے ہیں، اس کے مقابلے میں اجسام ان اعراض کو قبول کرنے میں تھک جاتے ہیں، جو ان کے لائق ہیں، چنانچہ اگر کوئی چیز سیاہ ہوتی ہو، تو پھر بعد میں وہ اور سیاہی کو قبول نہیں کرتی نفس ناطقہ کا حال یہ ہے کہ جس قدر زیادہ علم یہ حاصل کر لیتا ہے، اسی قدر زیادہ قابل یہ اس نئے علم کو حاصل کرنے کے ہو جاتا ہو، جو اب تک اس کو حاصل نہیں ہوا، اجسام کا حال یہ نہیں، چنانچہ جب کوئی جسم سیاہی قبول کر لیتا ہے، تو مزید سیاہی کو کم قبول کرتا ہے، اور جتنی زیادہ سیاہی قبول کرتا جاتا ہے، اس کی قابلیت سیاہی پذیری اسی قدر کم ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ یہ قابلیت بالکل ختم ہو جاتی ہے، مختصر یہ کہ نفس ناطقہ کی قوت بے نہایت ہوتی ہے، یہ اپنی ذات کیلئے فاعل ہو

[3] زاد المسافرین ص۲۹۵، [4] ایضاً ص۲۹۶ [5] زمانہ حال کی نفسیات اسی کو اس طرح بیان کریگی کہ نفس (ناطقہ) احساسی تہیجات کو وصول بھی کرتا ہو، اور استدلال بھی کرتا ہے، پہلی حالت میں یہ منفعل ہے، اور دوسری میں فاعل،

اور اوس کی ذات اوس کے لئے منفعل ہے[1]، اس کا عال روح نباتی یا روح نمائی، اور روح حیوانی یا روح حسی سے مختلف ہی حالانکہ یہی دونوں ارواح باعتبار وجود اس پر مقدم ہیں، اسی سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ ہیکل مردم میں اس کی پیدائش بھی ان دونوں کی پیدائش سے مختلف ہو[2]،

خلاصہ اس تمام طویل بحث کا یہ ہے کہ نفس نباتی، نفس حیوانی اور نفس ناطقہ، تینوں میں یہ بات مشترک ہے، کہ ان کی پیدائش اور ابتدا امزاج جسدی کے سوا اور کہیں نہیں ہوسکتی، لیکن مقدم الذکر دو نفوس (الفنسی و عنصری) مزاج میں اجرام فلکی کی تاثیر سے پیدا ہوتے ہیں، اور نفس ناطقہ کی پیدائش اس سے مختلف ہوا کرتی ہے، چنانچہ "دین حق" (اسلام) کے حکما، اور متقدمین فلاسفرین سے وہ جن کو متالہین کہا جاتا ہو، دونوں اس پر متفق ہیں، کہ نفس ناطقہ الٰہی اور ابداعی جوہر ہے[3]، اور صفات الٰہی کو قبول کرنے کی اہلیت رکھتا ہے، اسی کو بقائے ابدی ہے، یعنی جسم کو فنا کے بعد بھی یہ بذات خود قائم رہتا ہے[4]، اس کے برخلاف

[1] ناصر خسرو کی اصل عبارت یہ ہے:...... "وفاعل است مر ذات خویش را، و ذات او مر او را منفعل است" (ص۲۹۰) یہ جملہ ابہام انگیز ہے، اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ناصر خسرو کے نزدیک نفس ناطقہ بحیثیت فاعل اور نفس ناطقہ بحیثیت منفعل یا خود اس کے الفاظ میں اوسکی ذات دو علحدہ علحدہ اور قائم بالذات چیزیں ہیں، اصلیت یہ نہیں، ناصر خسرو کے نزدیک نفس ناطقہ ایک ہی ہے، وہی فاعل بھی ہے، اور منفعل بھی یہی نفس، و انفعال اس کے دو شئون ہیں، اس کو ہم چند سطرین قبل ہی واضح کرچکے ہیں، زمانۂ حال کے فلاسفہ و ماہرین نفسیات بھی اسکو تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ کانٹ ذات فاعل کو خالص ایغو (Pure ego) اور ذات منفعل کو "تجربی ذات" (Empirical self) کہتا ہے، ولیم جیمس ان کو علی الترتیب ذات بحیثیت عالم (Knower) اور بحیثیت معلوم (Known) یا مختصراً علی الترتیب محض "میں" (The "I") اور "مجھ" (The "me") کے نام سے موسوم کرتا ہے، فی زمانہ یہ عقیدہ بہت سے نئے مسائل کی تخلیق کا باعث ہوا ہے، [2] زاد المسافرین ص۲۹۶، ۲۹۷، [3] دیکھو حاشیہ ص۳۴۲ [4] حکیم ناصر خسرو شاید بھول گئے، کہ وہ ص۵۳ اور ص۵۴ پر نفس مطلق، نہ کہ نفس ناطقہ کے متعلق کہ آئے ہیں، کہ "آن جوہر بذات خویش زندہ است (ص۵۳) اور پس ظاہر کردیم کہ ...... انگو ہر یست کہ بذات خود خویش زندہ است، ...... وپس از فنائے جسد باقی ست" (ص۵۴) اصل یہ ہے کہ ماہیت نفس کی تمام بحث میں انھوں نے نفس (یا روح) کے ان تین مدارج کو پیش نظر نہیں رکھا ہو، ماہیت نفس کے متعلق انھوں نے جو کچھ بھی کہا ہے، اس میں نفس سے اُن کی مراد غالباً نفس ناطقہ ہے، لیکن بحث کے دوران میں انھوں نے

مقدم الذکر دونوں روحوں کا ثبات و وجود کالبد کے ثبات و وجود پر موقوف ہے اور کالبد کا ثبات و وجود اجرام فلکی کی تاثیر سے ہے[1]،

(۶)

نفس ناطقہ میں دو بڑی بڑی قوتیں ہوتی ہیں، ایک قوت علم اور دوسری قوت عمل، قوت علم کا پہلا کام اس اعتقاد کے ساتھ چیزوں کا تصور کرنا ہے، کہ یہ چیزیں ایسی ہی ہیں، افضل ترین عمل جو نفس کو اس قوت سے حاصل ہوتا ہو، یہ ہے کہ توحید پر اس کا اعتقاد مبنی بر صدق و یقین ہو، قوت عمل کا پہلا کام یہ ہے، کہ اس چیز کے طلب کی آرزومند ہو، جو اس کے جوہر میں مرکوز ہے، اور یہ طلب بقائے ابدی کی خاطر ہو، جس نفس میں دونوں قوتیں اور یہ دونوں فعل نہیں ہوتے وہ نفس بہیمی ہوتا ہے، اور جو نفس کہ دونوں کاموں سے نہیں تھکتا، وہ نفس فرشتگی ہوتا ہے، اس لحاظ سے نفس و جسم کا اتحاد اسی وجہ سے ہی کہ یہ دونوں قوتیں فعلیت میں آجائیں، چنانچہ کہا جاسکتا ہو کہ جسم نفس کیلئے ایک عمدہ سواری ہے، جس کے ذریعہ وہ (نفس) منزل قوت سے دیار فعل کی طرف آتا ہے[2]،

(۷)

اوپر نفس کی دو بڑی بڑی قوتوں کا ذکر ہوا ہی ایک قوت علمی اور دوسری قوت عملی ان میں یہ قوت علمی میں حواس کی وساطت سے فعلیت ہوتی ہے، یہ حواس پھر دو قسموں کے ہوتے ہیں، اول حواس ظاہری، اور دوم حواس باطنی، بالفاظ دیگر یہی دو قسموں کے حواس ہمارے ہر قسم کے علم کے ذرایع ہیں، اوراق آیندہ میں انھی حواس پر علحدہ علحدہ بحث ہوگی، پہلے ہم حواس ظاہری کو لیتے ہیں،

حواس ظاہری پانچ ہوتے ہیں، لامسہ، ذائقہ، سامعہ، شامہ، اور باصرہ[3]، یہ نفس کے گویا پانچ جسمانی آلات ہیں جن سے

(بقیہ حاشیہ ص۳۳۶) نفس نباتی اور نفس حیوانی کو بھی شامل کرلیا ہی، اسی سے بعض جگہ غلط مبحث پیدا ہوگیا ہی، چنانچہ ص۵۳ پر نفس کے متعلق کہا ہے، کہ "آن جوہر بذات خویش زندہ است" اور ص۵۴ پر اندرباتے کے الفاظ اضافہ کرکے نفس کو "نفس ناطقہ" کے ہم معنی کردیا، پھر ادھر جو کچھ بھی کہا ہی، وہ صراحۃً "نفس ناطقہ" سے تعلق رکھتا ہی، نہ کہ نفس مطلق سے، [1] زاد المسافرین ص۲۹۷ - ۲۹۸ [2] ایضاً ص۳۰۹، ۳۴۲ [3] حکیم ناصر خسرو کی ادبی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہی کہ وہ اپنی تحریروں میں تا بحد امکان عربی الفاظ سے اجتناب

کہ وہ جن چیزوں کا علم حاصل کرتا ہے ان حواس میں سے بعض دوسروں کے مقابلے میں شریف تر ہوتے ہیں، اور ان کا یہ شرف اس منفعت اور مضرت کے مطابق ہوتا ہے جس کو یہ حواس پیدا کرتے ہیں، اس لحاظ سے جس جس میں منفعت زیادہ ہو وہ شریف تر ہے، لیکن بے نطق حیوانات میں یہ شرف ذرا مختلف اصول پر ہوتا ہے،

ان حواس میں سے حاسۂ لمس عام ترین ہے، اس وجہ سے بھی کہ یہ تمام حیوانات میں ہوتا ہے، اور اس لحاظ سے بھی کہ لمس کی قابلیت اس کے تمام جسم میں ہوتی ہے، حیوان کیلئے اس کا فائدہ یہ ہے کہ جو درد و رنج اس کیلئے مہلک ہوتا ہے اسکو اس حاسہ سے معلوم کرکے اس سے پرہیز کرتا ہے، پھر مجامعت کی لذت کے سبب سے اپنے جوڑے کو اسی حاسہ کی مدد سے تلاش کرتا ہے تاکہ اپنی نوع کو فنا ہونے سے محفوظ کرے، اسی طرح حاسۂ ذوق میں حیوان کا فائدہ یہ ہے کہ وہ اسی کی وجہ سے اپنی غذا کی طرف رغبت کرتا ہے، بے نطق حیوانات میں حاسۂ لمس حاسۂ ذوق کے مقابلے میں افضل ہوتا ہے، اسی وجہ سے کہ ان میں حاسۂ ذوق ضعیف ہوتا ہے، اور اس سے اسکو لذت بھی کم حاصل ہوتی ہے، اس کے علاوہ غذا کی طرف جوان کو رغبت ہوتی ہے، وہ بھوک کی وجہ سے ہوتی ہے، نہ اس وجہ سے کہ وہ خوش ذائقہ اور بد ذائقہ غذا میں تمیز کرتے ہیں، چنانچہ پرندے عام طور پر دانوں کو بغیر توڑے کھاتے ہیں، لہذا وہ ان کے ذائقے کو محسوس ہی نہیں کر سکتے، اس کے مقابلے میں لمس سے وہ درد و رنج سے اجتناب کرتے ہیں، اپنے جوڑے کو حاصل کرتے ہیں، اور اپنی نوع کی نگہداشت کرتے ہیں،

حاسۂ سمع میں حیوانات کے لئے بہت کم منفعت ہوتی ہے، دلیل اسکی یہ ہے، کہ اکثر حیوانات میں یہ حاسہ ہوتا ہی نہیں، چنانچہ سانپ، مچھلی، چیونٹی، چوہا، مکھی، اور بعض پرندے اس سے محروم ہوتے ہیں[1]، اس محرومی کے باوجود ان کی پیدائش

(بقیہ حاشیہ ص ۳۳۷) کرتے ہیں، چنانچہ زاد المسافرین میں انھوں نے کثرت و تعدد کیلئے بسیاری، موجد یا خالق کیلئے باشانندہ، ساعد کیلئے برشوندہ، ماہیت کیلئے چہ چیزی، جنت کیلئے برانی، روش، طول، عمق اور ارتفاع کیلئے علی الترتیب پہنا، درازا، ژرفا اور بالا، قوت ارادی کیلئے خواست وغیرہ استعمال کئے ہیں، اپنے اسی میلان کے زیر اثر انھوں نے ان حواس ظاہری کے عربی ناموں کی بجائے فارسی نام وضع کئے ہیں، چنانچہ لامسہ کو بساوندہ، ذائقہ کو چشندہ، سامعہ کو شنوندہ، شامہ کو بوئندہ اور باصرہ کو نگرندہ کہتے ہیں، ڈاکٹر بخش نے کتاب کے آخر میں ان الفاظ کا ایک مختصر فرہنگ شامل کیا ہے، [1] یہ بیان ذرا مشکوک ہے، چنانچہ مشہور بات ہے کہ سانپ کے کان بہت تیز ہوتے ہیں، اسی طرح چوہوں میں بھی سماعت کا نہ ہونا بہت مشکوک ہے،

اور زندگی میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، حالانکہ یہی کمال حیوان ہے، حاسۂ شامہ کا فائدہ یہ ہے، کہ بے نطق حیوان اسی کے ذریعے مفید و مضر غذا میں تمیز کرتا ہے، چنانچہ جو سبزہ کہ ان کے لئے زہر ہے، اور جو پانی کہ ان کے لئے شور دار ہے، اس سے وہ اسی قوت کی مدد سے پرہیز کرتے ہیں، ان حیوانات میں یہ حاسہ اکثر دیگر حواس پر فضیلت رکھتا ہے، چنانچہ شکاری کتا جھاڑیوں اور کھیتوں میں اسی کی مدد سے زندہ پرندہ کا پتہ لگاتا ہے، اور چیونٹی بو ہی سے دانے کے مقام کو معلوم کرکے اس کو اپنے سوراخ میں لے آتی ہے، حاسۂ باصرہ حیوانات کے لئے بہت زیادہ سودمند اور نفع بخش ہے، یہ اسی کی مدد سے اپنے دشمن اور دوست میں مدد کرتے ہیں، اس کے علاوہ اسی سے وہ مرغوب غذا کو طلب کرتے، اور ضرر رساں اور مہلک مقامات سے دور بھاگتے ہیں،

لیکن نفس ناطقہ کے لئے حاسۂ سامعہ باقی تمام حواس پر افضل ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس ناطقہ کو دیگر نفوس پر جو فضیلت حاصل ہے، وہ صرف اس بنا پر ہے کہ یہ علم پذیر ہے، جس نفس کو حاسۂ سامعہ نہیں ہوتا، اس کو نہ تو بولنا آتا ہے، نہ وہ علوم ریاضی یا دیگر علوم حاصل کر سکتا ہے، یہاں تک کہا جا سکتا ہے، کہ جو شخص گنگ ہو، وہ در حقیقت بہرہ ہے، اس لئے بھی سامعہ کو فضیلت ہے، نفس ناطقہ کے لئے حاسۂ شامہ سب حواس سے کمتر ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جس شخص میں یہ حاسہ نہیں، اس کو سب سے بڑا نقصان یہ پہنچتا ہے، کہ وہ خوشبوؤں کو حاصل نہیں کر سکتا، لیکن اس کی تلافی اس طرح ہو جاتی ہے، کہ وہ بدبوؤں سے بھی محفوظ رہتا ہے، اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ نفس ناطقہ کے لئے جو حاسہ شریف ترین ہے، یعنی حاسۂ سامعہ وہ بے نطق حیوانات میں خسیس ترین ہے، اور حواس کیلئے خسیس ترین ہے، یعنی حاسۂ شامہ، وہ حیوانات کیلئے شریف ترین ہے، انسان میں قوت ذائقہ بہت لطیف اور قوی ہوتی ہے، اسی سے وہ چیزوں کی طرف رغبت کرتا ہے، اور بھوک کی لذت، یا تکلیف، کے علاوہ وہ لذتیں حاصل کرتا ہے، کہ بے نطق حیوانات کو میسر نہیں آتیں، حواس لامسہ اور باصرہ کے اعتبار سے انسان اور حیوانات میں کوئی فرق نہیں، دونوں ان حواس کی وجہ سے اپنے آپ کو گرمی اور سردی کی تکلیف سے محفوظ رکھتے ہیں، جنسی کھانے کی لذت حاصل کرتے ہیں، تاکہ ان کی نوع تلف نہ ہو جائے، اپنے دشمن سے دور بھاگتے ہیں، اور مہلک مقامات سے کنارہ کرتے ہیں، بر اینہم جو مخصوص منافع کہ نفس ناطقہ کو حواس سے حاصل ہیں، اور جن تک حیوانات کی رسائی نہیں اُن میں سے ایک علم ہے، اسی علم کی وجہ سے وہ حیوانات پر فضیلت رکھتا ہے

بے علم انسان تو بجائے بیل کی مانند ہوتا ہے، اور با علم فرشتوں کا ہم مرتبہ ہوتا ہے، بے علم انسان کے نفس تک یہ علم دو راستوں سے پہنچتا ہے، ایک قول اور دوسرا کتابت[1]، قول سے استفادہ ممکن ہوتا ہے سامعہ کی وجہ سے، اور کتابت سے باصرہ کی مدد سے یعنی اگر سماعت نہ ہو، تو قول کو سن نہیں سکتے، اور اگر بصارت نہ ہو تو تحریر کو پڑھنا ناممکن ہے، ان دو حواس کے ذریعے علم حاصل کرنے کے بعد انسان گائے بیل کے درجے سے ترقی کرنے کے بعد فرشتہ بن جا سکتا ہے، اسی واسطے کہا جا سکتا ہے، کہ انسان کے لئے یہ دونوں حواس باقی ماندہ حواس کی بہ نسبت افضل ہیں پھر ان دونوں میں سے سامعہ باصرہ کے مقابلے میں بھی شریف تر ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مادر زاد اندھا ہو، لیکن اس کی قوت سماعت درست ہو تو وہ سن کر بہت علم حاصل کر سکتا ہے، اگرچہ وہ شکلوں اور رنگوں کا تصور نہیں کر سکتا، اس کے مقابلے میں اگر کوئی شخص مادر زاد بہرا ہے، تو وہ سن کو بولنا ہی نہیں آتا، نہ وہ کوئی علم حاصل کر سکتا ہے، حالانکہ اس کی قوت بصارت میں کوئی فتور نہیں، اس کو ایسا پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے جس میں وہ اشاروں سے کام چلا سکے، مختصر یہ کہ جس طرح نفسِ نامیہ (نباتی) کا کمال یہ ہے کہ وہ نمو پذیر ہو اسی طرح نفسِ ناطقہ کا کمال یہ ہے کہ وہ علم پذیر ہو، اور نفسِ ناطقہ کا یہ کمال بغیر ان دو حواس کے حاصل نہیں ہو سکتا، اسی بنا پر ان دونوں حواس کو دیگر حواس کے مقابلے میں شریف تر مانا گیا ہے، جو فائدے کہ انسان کو ان دو حواس سے حاصل ہوتے ہیں، ان سے بے سخن حیوان محروم رہتا ہے، یہ نفسِ ناطقہ کیلئے مخصوص ہوتے ہیں، پھر یہ شخص درجہ علوم پر پہنچتا ہے، تو ان فوائد میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نفسِ ناطقہ کے یہ دونوں حواس زیادت پذیر ہوتے ہیں[2]،

(۸)

جن حواس ظاہری کا اوپر ذکر ہوا ہے، ان سے انسان صرف محسوسات کا علم حاصل کر سکتا ہے، معقولات کو حاصل کرنے کیلئے اس کو حواس باطنی کی ضرورت ہوتی ہے، کسی قول کی محض آواز، یا کسی تحریر کی شکل و صورت تو محسوسات میں سے ہے، اور اس آواز اور اس تحریر کے معنی معقولات میں سے، لیکن یہ خیال رکھنا چاہئے،

ـــــــــــــــ

[1] زاد المسافرین ص۲۹۴، [2] ایضاً ص۱۹-۲۲

کہ جو کچھ بھی حواس باطنی سے حاصل ہوتا ہے، وہ بالضرورت حواس ظاہری کے راستے سے گذر چکا ہوتا ہے[1]، چنانچہ مادر زاد اندھا شخص رنگوں اور شکلوں، اور مادر زاد بہرا شخص آوازوں اور لحنوں کا تخیل کر سکتا ہے نہ ان پر فکر کر سکتا ہے، حواس ظاہری کی طرح حواسِ باطنی بھی پانچ ہیں تخیل، وہم، حفظ، فکر، اور ذکر، یعنی یاد کرنا، بسطور آئندہ میں انہی پر بحث ہوگی،

حواس باطنی میں سے وہم گویا حرکت فکر ہے، یا عقل کی سب سے پہلی حرکت ہے، اس کے پس پشت حس ہوتی ہے، یعنی جس چیز میں حس نہیں ہوتی، اس میں وہم بھی نہیں ہوتا، لیکن حس کے مقابلے میں وہم زیادہ خطا پذیر ہوتا ہے، چنانچہ انسان اکثر زیانکار چیزوں کو سود مند سمجھتا ہے، اور بالعکس سود مند چیزوں کو زیانکار، وہم اور حس میں فرق یہ ہے، کہ حس کی فعلیت بیداری میں ہوتی ہے، اور وہم کی بیداری اور خواب دونوں میں، اس کے علاوہ حس سے حاضر اشیاء کا علم ہو سکتا ہے، لیکن وہم سے حاضر اور غائب دونوں اشیاء معلوم کی جا سکتی ہیں، حیوان میں وہم کا وہی درجہ ہوتا ہے، جو انسان میں عقل کا ہوا کرتا ہے، لیکن وہم کا اثر عقل کے اثر کی نسبت کمزور رہا کرتا ہے، انسان کی قصدی حرکات فکر کا نتیجہ ہوتی ہیں اور وہم نفس بہیمی کی حرکت ہے[2]، اس کی تعریف یہ ہے کہ یہ قوت ہے جس سے ہوا کی وساطت سے اشیاء دریافت کی جاتی ہیں، یا یہ کہ یہ وہ قوت ہے، جو محسوسات کے اثر کو قبول کرتی ہے، اس کے مقابلے میں قوت تخیلہ یا تخیل وہ قوت ہے، جو محسوسات کی صورت کو ان کے ہیولیٰ سے مجرد کر کے ان کی نگہداشت

ـــــــــــــــ

[1] کتاب زاد المسافرین کا جو قلمی نسخہ کیمبرج میں ہے، اس پر حاشیہ اور شرح بھی ہے، اس موقع پر حاشیہ نویس اور شارح کا یہ فقرہ بہت بصیرت افروز ہے:- "..... تخیل در چیزے بتواند کرد کہ اول از حواس ظاہر یافتہ باشد، وہمچنین تفکر و توہم والا در چیزے کہ بحواس ظاہر نیافتہ باشد، از راہ حواس باطن نمی تواند دانست، واگر کسی گوید کہ چیزے را تخیل و توہم کند، کہ بحواس ظاہر نیافتہ باشد، مثل آدم در مسود دریائے زیبق وامثال این گوئیم کہ چون آدم، و مرغ، ہر دو را دیدہ وہمچنین دریا و زیبق را تفصیل و ترکیب کند کار متفرقہ است، و این کار ہا کند" (ص۹۳ و ص۹۴) زمانہ حال کے ماہرین نفسیات بھی اپنی اپنی کتابوں میں تخیل کی بحث میں گویا اسی فارسی عبارت کا ترجمہ کر دیتے ہیں، چنانچہ دیکھو نفسیات مصنفہ پروفیسر اجمل ص۲۰۲، [2] لیکن چند سطریں قبل ہی کہا گیا ہے، کہ "وہم نخستین حرکت عقل است" (ص۲۳) اور عقل نفس ناطقہ کے لئے مخصوص ہے، لیکن اب یہاں وہم کو نفس بہیمی کی حرکت کہا جا رہا ہے، جو عقل سے معرا ہوتا ہے، اس تضاد کا کیا حل ہے؟

کرتی ہے، یہ قوت دماغ کے سامنے کے حصہ میں ہوتی ہے[1]، قوتِ متخیلہ ان صورتوں کو مجرد کرکے ان کو قوتِ حافظہ[2] کے سپرد کرتی ہے، یہ بھی ایک حسِ باطنی ہے، اور یہ موخر دماغ میں ہوتی ہے، ایک اور حسِ باطنی ذاکرہ ہے، جو ان محفوظ صورتوں کو حفظ میں سے واپس نکالتی ہے، قوتِ حافظہ اور قوتِ ذاکرہ میں سے مقدم قوتِ حافظہ ہوتی ہے، کیونکہ جب تک کہ کوئی چیز حفظ نہ کی جائے، اس وقت تک اس کا احیار یا تذکرہ ممکن نہیں ہو سکتا، جب قوتِ متخیلہ "صورتہائے شخصی، یا صورتہائے قولی یا صورتہائے کتابی" میں سے ایک صورت کو اس کے ہیولی سے مجرد کرتی ہے، اور قوتِ حافظہ کے سپرد کرتی ہے، تو قوتِ حافظہ اس صورت کی نگہداشت کرتی ہے، پھر جو صورت کہ قوتِ متخیلہ اس کے بعد اسکے سپرد کرتی ہے، قوتِ حافظہ اس کا مقابلہ پہلے کی صورت کے ساتھ کرتی ہے، جب یہ ان دونوں کو ایک دوسرے کے مشابہ پاتی ہے، تو اوس کو وہی صورت سمجھتی ہے اور جب یہ صورتیں ایک دوسری سے نہیں ملتیں، تو جان لیتی ہے کہ یہ وہ نہیں،

ان تمام حواس باطنی کے وظائف کو حکیم ناصر خسرو نے ایک لطیف تشبیہ کی صورت میں بیان کیا ہے، کہتے ہیں کہ قوتِ متخیلہ جو صورتوں کو اُن کے ہیولی سے مجرد کرتی ہے، گویا ایک لکھنے والا شخص ہے، جو صورتِ قول کو اس کے ہیولی یعنی ہوا اور آواز، اور صورتِ نوشتہ کو اس کے ہیولی یعنی سیاہی و کاغذ و حروف وغیرہ سے مجرد کرکے اس صورت بے ہیولی کو قوتِ حافظہ کے اندر لکھتا ہے، دوسرے الفاظ میں جو کچھ انسان کے حافظے میں ہوتا ہے، وہ نفسانی کتابت ہے، جس کو نفس قوتِ متخیلہ کے قوت حافظے کے کاغذ پر لکھتا ہے، چنانچہ ہم جانتے ہیں، جب ہم کسی تحریر یا قول کو حفظ کرتے ہیں، تو حروف والفاظ

[1] شارح کا خیال ہے کہ "۔۔ مراد از قوتِ متخیلہ حس مشترک است کہ مرجع محسوسات را کہ ہمہ حواس ظاہر دریابند دریابد و آن صورتہا را بجز از خیال سپارد، نہ قوتِ متخیلہ کہ جمہور آن را غیر حس مشترک دانند و کار او ترکیب و تحلیل صور است و مکان آن را کہ در مقدم دماغ گفتہ نیز موید ہمین است" (ص ۹۴) [2] شارح کے نزدیک :- "مراد از قوتِ حافظہ درین جا قوتِ خیال است کہ حافظ و نگہدارندہ صورت است، نہ قوتِ حافظہ کہ مصطلح قوم است کہ آن حافظ و نگہدارندہ معانی جزئی است، کہ واہمہ ادراک نمودہ پس قوتِ حافظہ بمعنی لغوی است نہ اصطلاحی، و اما تعیین مکان این قوت کہ حافظ صورت است موخر دماغ کردن درست است، مگر گوئیم کہ موخر بطن اول را خواستہ (ص ۹۴)

تو غائب ہو جاتے ہیں، اور وہ صورتِ مجرد باقی رہ جاتی ہے، جس کو قوتِ متخیلہ نے منتزع کرکے قوتِ حافظہ کے سپرد کیا ہے، قوتِ ذاکرہ گویا ایک شخص ہے، جو اس کتابتِ نفسانی کو پڑھتا ہے، چنانچہ ہمیں معلوم ہے کہ قوتِ ذاکرہ جب چاہتی ہے اُن نوشتوں کو پڑھ لیتی ہے، جو حفظ ہیں، اور خود وہ نوشتے اپنے اپنے حال پر باقی رہتے ہیں، اس کتابت کا حال عام جسمانی کتابت کا سا ہے کہ ان کو خواہ کتنا ہی پڑھا یا سنا جائے، ان کی حالت میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا، اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے، کہ نفس قوتِ ذاکرہ کی مدد سے اس "نوشتہ نفسانی" کو پڑھ سکتا ہے، جس کو قوتِ متخیلہ نے حافظہ کے کاغذ پر لکھا ہے، اور اس پڑھنے، آواز اور حروف شنودنی کو ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، چنانچہ اگر ہم کوئی شعر حفظ کر لیں، تو پھر بعد میں آواز بلند پڑھے بغیر اس کا اعادہ کر سکتے ہیں،

مندرجۂ بالا تشبیہ سے معلوم ہوا ہوگا کہ جس طرح نفس کی ظاہری کتابت و کتابت ہوتی ہے، اسی طرح باطنی کتابت و کتابت بھی ہوتی ہے، اور جس طرح اس کی ظاہری گفتاری و گفتہ ہوتا ہے، اسی طرح باطنی گفتاری و گفتہ ہوتا ہے، فرق یہ ہے کہ ظاہری جو کچھ ہے، وہ ہیولیہائے مصور ہے، اور باطنی جو کچھ ہے، وہ صورتِ بے ہیولی، لہذا ضروری ہے کہ ان مجرد صورتوں کو حاصل کرنے والی قوتیں لطیف ہوں، یہ قوتیں حواس باطن ہیں، باوجود اس کے کہ محسوسات و مدرکات بکثرت ہیں، لیکن پھر بھی یہ حواس باطن ان سب کیلئے تنگ نہیں، ان تمام صورتہائے ہیولانی کا نمایندہ مشاعر جسم میں پنج حواس ظاہری ہیں، ان حواس کی خصوصیت یہ ہے، کہ یہ دو چیزوں کو بیک وقت اور بیک جا حاصل نہیں کر سکتے، بلکہ ایک ایک کرکے پاتے ہیں، محسوسات ان کے اندر پہنچ کر ایک دوسرے کی مزاحمت کرتے ہیں، اور ان کے لئے ان حواس کے اندر جگہ تنگ ہو جاتی ہے، چنانچہ ایک ہی مقام پر دو حرف نہیں لکھے جا سکتے، اس کے مقابلے میں کتابت نفسانی میں بہت سے مختلف علوم جگہ پاتے ہیں، اور ان کے آپس میں نہ مزاحمت ہوتی ہے، نہ اُن کے لئے جگہ کی تنگی ہوتی ہے،[1]

[1] زاد المسافرین ص ۲۱۱-۲۱۳، حکیم ناصر خسرو نے اپنی مثنوی روشنائی نامہ (مطبوعہ کاویانی ص ۱۹) میں حواس ظاہری و باطنی اور ان کے وظائف کو بہت خوبی اور اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے، کہتے ہیں :-

ترا زین خان شش سورہ گزر شد، درین خان خانہ تو پنج در شد،

مختصر یہ کہ قدرت نے اشیائے عالم کو دریافت کرنے کیلئے دو آلات بنائے ہیں، ان میں سے ایک تو حواس ظاہری ہیں، جن سے محسوسات و مشاہدات دریافت کئے جاتے ہیں، اور دوسرے حواس باطنی ہیں، جن سے نامحدود و نامتناہی چیزیں دریافت کی جاتی ہیں، اب چونکہ انسان اپنے حواس ظاہری سے تمام متناہیات و جسمانیات کو دریافت اور ان کے تمام منافع و فوائد کو حاصل کر لیتا ہے، لہذا ضروری ہے کہ وہ حواس باطنی سے نامتناہیات کو دریافت اور قبول، اور اون کے تمام فوائد کلی کو حاصل کرے کہ اسی کا نام عقل ہے، ہمارے اس دعوی کی، کہ انسان نے اپنے حواس ظاہر سے تمام اون فوائد و لذات و منافع کو حاصل کر لیا ہے، جو اس دنیا میں موجود ہیں، اور اب کوئی چیز ایسی نہیں رہی جس کو اوس نے چھوڑ دیا ہو، یا جو اس سے پوشیدہ رہی ہو، دلیل یہ ہے کہ زمانہ دراز گذر گیا، اور اب تک کوئی نئی چیز ایسی پیدا نہیں ہوئی کہ انسان پہلے ہی سے اوس سے واقف نہ ہو۱؎

(بقیہ حاشیہ ص۳۴۳) گشادہ بر درے در بوستانے — زہر در اندر آید کاروانے،
اگرچہ اندرین خانہ غریبی، — ازین بر پنج دریا بانصیبی،
یکے چشمت کو بیند عجائب، — شود زین دیدنی رائے تو صائب،
دگر گوشت کہ شہر او کلامست، — دلت را زان معانی بس تمامست،
دگر بینی کہ بوئے گل پذیرد، — دماغ و دل ز بویش ذوق گیرد
ز ذوق و لمس نعمت ہست بہرہ، — چو نرمی یا درشتی دست بہرہ
حواس ظاہر اندر این پنج باطن، — بود پنج دگر اے یار محسن،
خیال و وہم و فہم و حفظ دیگر، — کہ حس مشترک خوانیش بر سر،
خطا بینند باز این پنج گانہ، — توانی راست بین شان کردیانہ
ریاضت کش مراد راست بین کن، — پس آنگاہے گمانت را یقین کن،
چو اینہا راست بین گشتند از آن پس — ترا سرمایہ این اندر جہان بس،
گشادہ گردد آنگہ چشم بینش، — ببینی آن ورائے آفرینش،

۱؎ یہ دلیل بہت ہی عجیب و غریب ہے، اس کو تسلیم کر لینے سے کیا انسان (نعوذ باللہ) عالم الغیب والشہادہ نہیں بن جاتا؟

اب رہا یہ دعوی کہ انسان حواس باطنی سے نامتناہیات پر اطلاع پاتا ہے، سو اس کی دلیل یہ ہے، کہ حواس باطنی کی قوت بھی نامتناہی ہے، چونکہ متناہی قوت والے حواس یعنی حواس ظاہری سے موجودات متناہی سے واقفیت ہوتی ہے، لہذا ظاہر ہے کہ نامتناہی قوت والے حواس یعنی حواس باطنی، موجودات نامتناہی کا علم مہیا کریں گے خصوصًا اس لئے بھی کہ نامتناہیات کی اصل یعنی عقل بھی انسان کو عنایت ہوئی ہے، اس پر معترض کہہ سکتا ہے، کہ جب انسان نامتناہی پر مطلع ہو جاتا ہو، تو یہ نامتناہی اس کے لئے متناہی بن جاتا ہے، چنانچہ اگر یہ صحیح ہے کہ آسمان اپنی اس وسعت کے باوجود آنکھ کے تل میں سما سکتا ہے، اور اس قدر مختلف و متلون صورتیں قوت متخیلہ میں جو کاسہ سر کے اندر ہے، جگہ پا سکتی ہیں، تو یہ بھی صحیح ہے کہ نامتناہیات اپنی بے نہایتی کے باوصف، نامتناہی قوتوں کو متناہی کر دیں، لیکن ہمارے اس قول کی تائید کہ انسان اپنے حواس باطنی سے روحانیات کے کلیات نامتناہی سے مطلع ہو جاتا ہے، حواس ظاہری کے ضائع نہ ہونے سے ہوتی ہے، اس کے علاوہ جب انسان حواس ظاہری سے تمام فوائد جسمانیات کو حاصل کر لیتا ہے، تو ضروری ہے کہ وہ حواس باطنی سے تمام فوائد عقلانی کو حاصل کرے، اور پھر بھی یہ نامتناہی قوتیں ضائع نہ ہوں، بعینہٖ اس طرح جیسے کہ متناہی قوتیں ضائع نہیں ہوتیں۱؎

(باقی)

سیر الصحابہ حصہ ششم

جس میں بہ ترتیب چار اہم ہستیوں حضرت امام حسن، حضرت امیر معاویہ، حضرت امام حسین اور حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کے حالات و سوانح اخلاق و فضائل، اور ان کے مذہبی، علمی، اخلاقی، اور سیاسی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے، ضخامت ۳۰۶ صفحے، قیمت ؏

(بقیہ حاشیہ ص۳۴۴) لیکن شارح کا خیال ہے کہ "اگر کسے گوید کہ بسیار چیزہا درین زمانہا نزدیک ظاہر شدہ است کہ پیش ازین ظاہر نبود ست، این حکم چگونہ راست باشد؟ گوئیم کہ بعض چیزہا کہ بر بعض مردم بعض اقالیم ظاہر شدہ آن نیست کہ بعض مردم اقالیم دیگر ندانستہ اند، بلکہ برآنہا ظاہر...... (یہاں ایک لفظ کرم خوردہ ہے، صحیح کو معلوم نہ ہو سکا کہ کیا ہے،) نہایتش بر مردم اقالیم دیگر بعد از مدتے رسیدہ، پس چیزے نبودہ کہ بر مردم ظاہر نشدہ است" (صفحہ ۵، صفحہ ۹) زاد المسافرین ص ۲۶۹-۲۷۰،

فردوسی کا بزمیہ کلام

از

جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی

عجم کا نامور شاعر فردوسی اپنی غیر فانی رزمیہ نظم شاہنامہ کے ذریعہ شہرت دوام حاصل کر چکا ہے، اس لئے اس شاہکار کے بعد کسی دوسرے کلام کو اس سے منسوب کرنے کی حاجت باقی نہیں رہتی، لیکن مورخین اور تذکرہ نویسوں نے شاہنامہ اور مثنوی یوسف زلیخا کے علاوہ بھی فردوسی کے بزمیہ کلام از قسم قصائد و غزلیات، قطعات، رباعیات وغیرہ کا ذکر کیا ہے، اور بعض نے متفرق اشعار بھی نقل کئے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایران کا یہ مایۂ ناز رزمیہ نویس بزمیہ شاعری پر بھی قدرت رکھتا تھا، اگرچہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ فردوسی نے کوئی دیوان مرتب کیا ہو، دولت شاہ کے اس بیان سے کہ

"شاعری پیشہ ساختہ، قطعہ و قصائد می گفت از خاص و عام وجہ معاش بدو می رسید[1]"

معلوم ہوتا ہے کہ شاہنامہ لکھنے سے پیشتر فردوسی بھی اور پیشہ ور شاعروں کی طرح قصائد و غزلیات لکھکر معاش حاصل کرتا ہوگا، لیکن نظامی عروضی کا بیان ہے، کہ فردوسی کا پیشہ زمینداری تھا جس کی آمدنی سے وہ کسب معاش کرتا تھا[2] اسلئے ظاہر ہے کہ معیشت کے لئے وہ کسی کا محتاج نہ تھا اسی طرح جو اشعار قصائد وغیرہ کے ملتے ہیں، اُن سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا، کہ اوس نے مدح گوئی کو اپنا پیشہ بنالیا ہو، بہرحال اس سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ فردوسی نے قصائد و غزلیات وغیرہ کہے تھے جن کا بہت سا حصہ برباد ہو گیا، اور بالفعل نایاب ہے،

[1] تذکرہ دولت شاہ ص۵۱ طبع بمبئی، [2] چہار مقالہ ص۴۸ طبع ایران شہر برلن،

خود فردوسی اپنی مثنوی یوسف زلیخا میں[1] جو اس کی آخر عمر کی تصنیف ہے، اپنے عاشقانہ اشعار و غزلیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:-

بسے نامۂ دوستاں گفتہ ام، الخ

ہمیدوں بسی راندہ ام گفتگوے ز خوبان شکر لب ماہروی،

لیکن صاحب مرأۃ الخیال کے نزدیک شاہنامہ کے سوا فردوسی کا اور کلام نہیں ہے[2] اس پر تنقید کرتے ہوئے مولینا آزاد فرماتے ہیں:-

"تذکرۂ مرأۃ الخیال میں جو لکھا ہے کہ سوائے شاہنامہ کے کوئی اور نظم اوس کی نہیں یہ غلط ہے کیونکہ قصہ حضرت یوسف راقم نے بچشم خود دیکھا ہے ××× دو قطعہ جو تاریخ ہفت اقلیم میں دیکھے گئے اہل اخلاق کیلئے تحفۂ دلکش ہیں[3]"

اس کے بعد آزاد نے ہفت اقلیم کے حوالہ سے تین قطعے اور ایک رباعی نقل کئے ہیں،

حمد اللہ مستوفی نے لکھا ہے، کہ شاہنامہ کے علاوہ فردوسی کے عمدہ اشعار ہیں، اور ایک غزل کے چار شعر نقل کئے ہیں[4]،

لطف علی آذر نے بھی فردوسی کے اشعار نقل کئے ہیں، اور لکھا ہے کہ

"چندبیتے از قصائد و قطعات و رباعیات کہ در بعضے کتب متفرقہ بنظر رسیدہ منتخب و نوشتہ شد[5]"

رضا قلی ہدایت نے بھی لکھا ہے، کہ مثنویات کے علاوہ فردوسی کے قصائد اور غزلیات بھی تھیں، جو باقی نہیں رہیں[6] اور متفرق اشعار نقل کئے ہیں،

فردوسی کے بزمیہ کلام (قصائد و غزلیات وغیرہ) پر یورپین مستشرقین ڈاکٹر ایتھے (ETHE) نے ایک

[1] چند سال ہوئے پروفیسر شیرانی نے رسالہ اُردو میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں مثنوی یوسف زلیخا کو فردوسی سے منسوب کرنے کی وجوہ پر مفصل بحث کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی، کہ یہ مثنوی فردوسی کی تصنیف سے نہیں ہے، [2] مرأۃ الخیال ص۴۲ طبع بمبئی، [3] نگارستان فارس ص۱۶۰، ۱۶۱، [4] تاریخ گزیدہ ص۸۲۲ طبع عکسی لندن، [5] آتش کدہ [6] مجمع الفصحا جلد اول ص۳۸۲، ۳۸۳،

مضمون بعنوان FIRDUSI ALS LYRIKER لکھا تھا، جو میونخ (جرمنی) کے رسالہ SITZUNGSBERICHTE (جلد ۲ ۱۸۷۲ء صفحہ ۲۷۵، صفحہ ۳۰۴ اور جلد ۳ ۱۸۷۳ء صفحہ ۲۲۷، صفحہ ۳۰۳ (۴۵۳)) مین شائع ہوا تھا، پروفیسر براؤن نے اس مضمون کا حوالہ اپنی کتاب مین دیا ہی[1] اصل مضمون جرمن زبان مین اور بالفعل نایاب ہے صرف اس قدر معلوم ہو سکا کہ ایتھے نے اپنے مضمون مین جن کتابون کا حوالہ دیا ہی وہ حسب ذیل ہین:-

۱- مجموعۂ اشعار شعرائے متقدمین یعنی ایک سو ستر شعرا کے اشعار جو زیادہ تر فردوسی کے پیش رو اور اس کے معاصر شعراء کے کلام کے انتخاب پر مشتمل ہی، اس کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس کے کتبخانہ مین موجود ہی

۲- مخزن الغرائب، تذکرۂ شعراء فارسی قلمی،

۳- مخزن الغرائب، اسی نام کا ایک اور رسالہ،

۴- لباب الالباب عوفی،

۵- آتشکدۂ آذر،

۶- ہفت اقلیم امین رازی،

۷- ریاض الشعراء والہ داغستانی،

۸- لب لباب،

۹- خلاصۃ الافکار،

۱۰- تحفۂ

۱۱- منتخب التواریخ بدایونی،

مندرجۂ بالا کتابون مین فردوسی کے جو اشعار منقول ہین، ان کو ایتھے نے یکجا جمع کر دیا ہی، جن مین ایک قصیدہ ۵۰ شعر کا، تین غزلین، چھ رباعیان، تین قطعے اور دو قصیدے اور ہین، لیکن ایتھے کے منقولہ بعض قطعے اصلی نہین ہین

[1] لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد ۲ صفحہ ۱۴۳ کا نوٹ نمبر ۱،

جیسا کہ ان کی سست بندش اور بے ربطی سے پایا جاتا ہی، اسی بنا پر ایک ایرانی محقق نے یہ اعتراض کیا ہی کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مدح مین جو اشعار ہین، وہ تمامتر متوسطین اور متاخرین کی تصنیف سے ہین[1]

ایتھے کی کتب مرجوعہ مین اکثر قلمی کتابین ہین، جو عسیر الحصول ہین، اس لئے اس کی بیان کردہ تین مطبوعہ کتابون لب الالباب، آتشکدہ، اور منتخب التواریخ کے علاوہ بعض دیگر کتب تذکرہ کی مدد سے ہم ذیل مین فردوسی کے اشعار نقل کرتے ہین،

۱- لباب الالباب عوفی، (جلد دوم صفحہ ۳۳ طبع لندن)

بسے رنج دیدم بسے گفتہ خواندم	زگفتار تازی و از پہلوانی،
بچندین ہنر شصت و دو سال بودم	کہ گوشہ برم زانکہ روشنانی،
بجز حسرت و جز وبال گناہان،	ندارم کنون از جوانی نشانی،
بیاد جوانی کنون مویہ آرم،	بدین بیت بوطاہر خسروانی،
جوانی من از کودکی یاد دارم،	دریغ از جوانی دریغ از جوانی،

۲- تاریخ گزیدہ (صفحہ ۸۲۳) طبع عکسی لندن)

شبے در برت گر برآسودمی،	سر فخر بر آسمان سودمی،
قلم در کف تیر بشکستمی،	کلاہ از سر مہر بربودمی،
بقدر از نہم چرخ بگذشتمی،	بہ پی فرق کیوان بفرسودمی،
بہ بیچارگان رحمت آوردمی،	بدرماندگان بر بخشودمی،

۳- ہفت اقلیم (نگارستان فارس صفحہ ۱۶۱، صفحہ ۱۷۰)

فلک گر بزیر نقاب اندر است	وگر زیر تیر عتاب اندر است

[1] مجلہ کاوہ ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ صفحہ ۳ طبع برلین،

سپندار گو از پئے کار تو
بہ بندِ خطا و تواب اندر است

اگر بہ کنی کینہ خود بری
نہ چشم زمانہ بخواب اندر است

برا یوانها نام بیژن هنوز
بزندانِ افراسیاب اندر است

بسے رنج دیدم بسے گفتہ خواندم الخ (مطابق تاریخ گزیدہ)

بیا بگوے کہ پرویز از زمانہ چہ بُرد
برو بپرس کہ کسری ز روزگار چہ خورد

گر او گرفت ممالک بدیگران بگذاشت
ور این نهاد خزائن بدیگران بسپرد

تا چند نهی بر دل خود غصۂ درد
تا جمع کنی سیم سفید و زر زرد

زان پیش کہ گرد و نفس گرم تو سرد
با دوست بخور کہ دشمنت خواهد خورد

۴۔ منتخب التواریخ (جلد اول ص۱ طبع کلکتہ)

خجستہ درگہ محمود زابلی دریاست
چگونہ دریا کا نرا کنارہ پیدا نیست

شدم بدریا غوطہ زدم ندیدم دُر
گناہ بخت من است این گناہ دریا نیست

۵۔ آتشکدہ (ص۹۳، ص۹ طبع بمبئی)

مستست ہمی چشم تو و تیر بدست
بس کس کہ ز تیر چشم تو نجست

گر پوشد عارضت زرہ عذرش ہست
کز تیر بترسد ہمہ کس خاصہ زمست

بیا بگوی کہ پرویز از زمانہ چہ خورد الخ (مطابق ہفت اقلیم)

بسی رنج دیدم الخ (مطابق مذکورۂ بالا) صرف ۲ شعر

تا چند نهی بر دل خود غصہ و درد الخ (مطابق ہفت اقلیم)

دوش از سر لطف بندہ پرور دن خویش
بنمودی طریق مردی گردن خویش

جرمم ہمہ عفو کرد و دستم بگرفت
خندان خندان فگند در گردن خویش

۶۔ مجمع الفصحا (جلد اول ص۳۳، ص۳۳ طبع ایران)

شہی کہ چون بدو انگشت در ز خیبر کند
برآمد از پے اسلام صد ہزار انگشت

علی عالی اعلی کہ دست قدرت او
ہزار رہ زدہ در چشم روزگار انگشت

حکیم گفت کسے را کہ بخت والا نیست
بہیچ وجہ مراو را زمانہ جویا نیست

برو مجاور دریا نشین مگر روزی
بدستت افتد دری کجاش ہمتا نیست

خجستہ درگہ محمود زابلی دریاست الخ (مطابق منتخب التواریخ)

بیا بگوی کہ پرویز از زمانہ چہ خورد الخ (مطابق مذکورہ بالا)

دو چیز بر تو بے خطر بینم
کانرا خطر است نزد ہر ہنر

دینار چو بر نهی لب بر تاج
در معرکہ جان چو بر نهی مغفر

اگر بدانش اندر زمانہ لقمان وار
سرای پردۂ عصمت بر آسمان زدۂ

وگر ز کتب فلاطون و ارسطاطالیس
ہر آنچہ ہست پسندیدہ پاک بستدۂ

اگر سپہبد سیصد ہزار شہر شوی
وگر برہمن ششصد ہزار بتکدۂ

بہ پیش ضربت مرگ این ہمہ ندارد سود
ہمی بباید رفتن چنانکہ آمدۂ

"در اظہار تاسف از جوانی و تضمین بیت ابوطاہر المتخلص بخسروانی"[۱] (مطابق عوفی وغیرہ)

"از غزلیات اوست"

نجی در برت (مطابق گزیدہ وغیرہ)

اسمیں ایک شعر زائد ہے، اور "درماندگان" کی بجائے "دلدادگان" ہے،

جمال تو گرزان کہ من دارمی
بجائے تو گرزان کہ من بودمی

"در حضور سلطان محمود بر حسب امر بجہت دمیدن خط ایاز او یماق گفتہ"

---

[۱] ابوطاہر الطیب بن محمد الخسروانی طبیب، شعرائے آل سامان میں سے تھا، (لباب الالباب ج ۲ ص۳)

ستست ہمی چشم تو دیر بہ ست
بر کس کہ زتیر چشم مست تو بخست
گر پوشد عارضت زرہ عذرش ہست
کز تیر بترسد ہمہ کس خاصہ زمست

غم در دل من در آمد و شاد برفت
باز آمد و رخت خویش بنہاد برفت
گفتم بہ تکلف کہ زمانی بنشین
بنشست و کنون رفتنش از یاد برفت

تا چند ہمی بر دل خود غصہ و درد، الخ (مطابق ہفت اقلیم وغیرہ)

دوش از سر لطف بندہ پرور دن خویش، الخ (مطابق آتشکدہ)

(۷) دیباچہ شاہنامہ (طبع بمبئی صفحہ وصفحہ)

فردوسی کے حالات کے ضمن میں لکھا ہے کہ ایک مجلس میں جب کہ تمام درباری شعراء حاضر تھے، سلطان محمود نے ایاز کے سبزۂ خط کی توصیف میں رباعی کہنے کی فرمایش کی شعرانے فردوسی کی طرف اشارہ کیا، اوس نے فی البدیہہ کہا:-

مست است بتا چشم تو و تیر بہ دست، الخ (مطابق مجمع الفصحاء)

سلطان کو یہ رُباعی بہت پسند آئی اور اوس نے فردوسی کی بہت تعریف کی،

سلطان محمود کے وزیر احمد بن حسن میمندی، اور فردوسی میں مخالفت تھی، اس وجہ سے فردوسی کے احباب اسکو اس بات کی ترغیب دیا کرتے تھے، کہ وہ اس کی مخالفت ترک کرکے اس کے ساتھ موافقت پیدا کرلے، مگر فردوسی اسکی کچھ پروا نہیں کرتا تھا، اور کہتا تھا:-

من بندہ کز مبادی فطرت نبودہ ام
مائل بمال ہرگز و طامع بجاہ نیز
سوی در وزیر چرا ملتفت شوم
چون فارغم ز بارگہ پادشاہ نیز

فردوسی جب غزنین سے روانہ ہوا تھا، تو جامع مسجد کی دیوار پر یہ اشعار لکھ آیا تھا:-

خجستہ درگہ محمود زابلی دریاست الخ

ان کتابوں کے علاوہ بعض لغت کی کتابوں میں بھی فردوسی کے اشعار ملتے ہیں، جو سند میں لائے گئے ہیں، مثلاً:-

۱- فرہنگ شعوری:-

لغت "ترک" کی سند میں:-

بہ و چگونہ و ہم کسو نی کہ از شرفش
کلاہ گوشۂ عرش است و ترک شب پوشم

لغت "ذوش" کی سند میں:-

بانگ کرد ست اے بت سیمین
ذوش خواندم ترا کہ ہستی ذوش

لغت "گوش" کی سند میں:-

پاس می داشتم برائے و بہوش
وز خطاب کسم نیامد گوش

۲- مجمع الفرس،

لغت "درغ" کی سند میں:-

دل برد مرا و نزد مردم نشمردم (کذا)
گفتا کہ چہ سود است کہ درغ آب برد

لغت "فلالوش" کی سند میں:-

بر گرد گل سرخ تو خطی بکشیدی،
تا خلق جہان را بفلالوش فگندی

مگر اسدی طوسی نے اس شعر کو رودکی سے منسوب کیا ہے، اور اس کو اس طرح لکھا ہے:-

گرد گل سرخ اندر خطی بکشیدی
تا خلق جہان را بفگندی بفلالوش

۳- فرہنگ جہانگیری،

لغت "سکسک" کی سند میں:-

اسپے چنانکہ دانی زیر از میان زیر
در کابلی کہ داشت نہ سکسک نہ راہوار

[1] لغت فرس صفحہ ۵۳ طبع جرمنی،

ان مآخذ کے علاوہ بھی اگر تحقیق کی جائے تو ممکن ہے کہ لغت کی کتابوں اور اشعار کی بیاضوں میں فردوسی کا اور کلام بھی حاصل ہو سکے،

یہ تمام اشعار جو اوپر نقل کئے گئے ہیں، بہت ممکن ہے کہ ان میں بعض اشعار فردوسی کے نہ ہوں، لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ اکثر حصہ اسی کی تصنیف سے ہے، اور اسی کے نام سے تذکروں میں منقول چلا آتا ہے، اب رہا یہ سوال کہ یہ اشعار فردوسی کے شایانِ شان ہیں یا نہیں؟ تو اس زمانہ کے طرزِ سخن کو دیکھتے ہوئے ہم فردوسی کے اس کلام کو معیارِ سخن سے گرا ہوا نہیں پاتے، اگرچہ بعض سخن فہموں کے نزدیک وہ اس قدر وقیمت کا مستحق نہیں ہے جیسا کہ فردوسی کے کلام کو ہونا چاہئے، چنانچہ پروفیسر براؤن بھی اس کے متعلق یہی رائے رکھتے تھے، لیکن عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جن شعراء نے کسی خاص صنفِ نظم میں کمال پیدا کیا ہے، ان کا دوسرا کلام وہ وقعت اور رتبہ حاصل نہیں کر سکا ہے، وجہ ہے کہ نظامی گنجوی جو مثنویات کے امام مانے گئے ہیں، ان کی غزلیات وقصائد میں وہ رنگ پیدا نہ ہو سکا، جو مثنویات میں ان کا امتیازی وصف ہے، بہرحال ہمارے پاس اس وقت فارسی کے ایک قدیم اور نامور شاعر کے کلام کا کچھ حصہ جو اس نے شاہنامہ کے علاوہ لکھا تھا، موجود ہے، اور اصناف قصیدہ وغزل وغیرہ میں فردوسی کے طرزِ سخن اور اندازِ کلام کو ظاہر کر رہا ہے،

خیام

(از سید سلیمان ندوی،)

خیام کے سوانح، تصنیفات اور فلسفہ پر تبصرہ، اور فارسی رُباعی کی تاریخ، اور رباعیاتِ خیام پر مفصل مباحث، اور آخر میں خیام کے چھ عربی وفارسی رسالوں کا ضمیمہ، اور اوس کے قلمی رباعیات کے ایک نسخہ کی نقل شامل ہے، خیام کے مباحث پر سب سے مفصل، مکمل اور حتی المقدور محققانہ، یہ سب سے پہلی کتاب لکھی گئی ہے، ضخامت ۴۰۰ صفحات، کتابت وطباعت وکاغذ اعلیٰ، قیمت غیر مجلد ہے، مجلد للعہ

منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ

مقبرۂ شاہ بیگم

از

مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی مولف حیاتِ جلیل، الٰہ آباد،

خلوص ووفا کی پیکر، بے قرار اور دردمند دل والی بیگم آج اپنے شوہر جہانگیر کے قربِ ظاہری سے محروم اور اس کی آخری آرام گاہ سے منزلوں دور ہے، وہ الٰہ آباد میں دفن ہے اور جہانگیر لاہور میں، مگر اس کی بے چین روح کو تسکین وتسلی ہے کہ خسرو باغ کی یہ ڈھائی گز زمین اس کی ابدی خواب وراحت کے لیے اس کے غمگسار سرتاج نے پسند کی تھی اسی کے نازبردار ہاتھوں سے سپردِ خاک ہوئی، وہ جیسی نفیس مزاج، جمیل وخوبصورت تھی نصیبوں سے ویسی ہی حسین ودلکش قبر بھی پائی، یہ مقبرہ نہایت خوش قطع غیر معمولی طرز کا ہے، ہندؤوں اور اندلسی مسلمانوں کے ملے جلے طریق تعمیر کا بہتر نمونہ، بیگم نے ایک ہندو راجہ کے گھر جنم لیا تھا، ایک مسلمان بادشاہ کے یہاں دم توڑا، اس لئے اسکا مدفن دونوں کی مخلوط ومتحد یادگاروں کی نظیر ہے، اکبر کے عہد کا عروج تھا، اور جہانگیر کی ذاتی نگرانی اور توجہ[1] ایسی چیز تیار ہو گئی جس کی مثال دوسری جگہ کم ملے گی تفصیل آگے آتی ہے۔

سلاطینِ اسلام کے مختلف خاندانوں اور مختلف دوروں کے مختلف طرزِ تعمیر سے صاحبانِ فن واہل نظر کو اطلاع واگاہی ہے، اس لیے صراحت وتشریح کی ضرورت نہیں، اسقدر یاد دلا دینا کافی ہے کہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کے زمانہ میں عربی تعمیرات کا اثر ختم ہو کر ہندؤوں اور ایرانیوں کا اثر قائم ہو گیا تھا، یا یوں کہئے کہ عربی طرزِ تعمیر کے بجائے ہندی طرزِ تعمیر غالب ہو کر جدید مغلیہ طرزِ تعمیر کی بنیاد پڑی تھی، جہانگیری طرزِ تعمیر میں جو مغلیہ طرزِ تعمیر کا وسطی یا دوسرا دور ہے، عربی اور ایرانی طرز کے ساتھ ہندؤوں اور بودھوں کا طرزِ تعمیر بھی نظر آتا ہے۔

[1] مرقع اکبر آباد، از مولوی سید احمد مارہروی، صفحہ ۶،

یہ مقبرہ اس اتحاد کی زندہ یادگار اور جہانگیری عمارات مین نقشِ اولین ہے،

یہ سنگین و خوشنما نازک عمارت باغ کے پچھم جانب خسرو باغ کا تیسرا[1] مقبرہ ہے مسٹر ہبل[2] کے حساب سے

دوسرا اور زمانۂ تعمیر کے لحاظ سے پہلا،

باغ کے صدر جنوبی دروازہ سے دو سَو اسّی قدم کے فاصلہ پر بالکل سامنے یہ سہ منزلہ عمارت واقع ہے

اتفاق سے آجکل اس کے قریب ہی املی کے ایک پرانے درخت کی شاخین راستہ پر بڑھ آئی اور پھیل گئی ہین

جس سے نگاہ کو دفعۃً رک جانا پڑتا ہے لیکن اسکا سایہ سایۂ رحمت اور باعثِ راحت و فرحت ثابت ہوتا ہے

اور دو سرا ہی قدم یا دوسری ہی نظر ڈالنے پر مقبرہ کا سنگین چبوترہ، بلند کرسی، سطحِ زمین سے ملا ہوا دروازہ بلکہ

عمارت کی ہر چیز گنبد مع کلس سامنے آجاتا ہے، پھاٹک سے یہان تک پہنچنے کے لئے فراخ وکشادہ سڑک موجود ہے

جو تقریباً آدھے راستہ تک خوب پختہ، سواری لے جانے کے قابل بنی ہے، اس کے دونون جانب دلآویز روشین

سرسبز وشاداب پھولوں کی کیاریاں، خوشنما جھاڑیاں اور جابجا بڑے بڑے گھنے درخت بھی ہین، بقیہ نصف راہ

صرف پیادہ طے کرنا ہوتی ہے، کیونکہ گھومنے والوں کے لئے پختہ سڑک یہان سے بائین کو گھوم جاتی ہے اور چند

پتھر یہان سدِّ راہ کھڑے کر دیئے گئے ہیں، مرنے والون کی عظمت منزلت اور قبرون کی حرمت، ادب واحتیاط

کا اقتضا یہی تھا، یہ تجویز پرانی ہو یا حال کی اصلاح، ضرور قابلِ تحسین و اعتراف ہے،

اس مقبرہ اور اس کے حوالی کا ایک مکمل نقشہ صاف اور اچھا، خفیف رنگین، امیر الدولہ گورنمنٹ لائبریری

لکھنؤ میں موجود ہے جس کے نیچے ذیل کی عبارت لکھی ہے،

Mau soleum of the Ranee wife of the Emperor Jah-
-angir near Allahabad Drawn and engraved by Thos
Daniell

[1] آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا جلد دوم یعنی دی مانومنٹل انٹی کوئیٹیز اینڈ انسکرپشنس، مولفہ ڈاکٹر اے فوہرر پی ایچ ڈی مطبوعہ ۱۸۹۱ صفحہ ۱۳۳، [2] پریاگ یا الٰہ آباد کی ہینڈ بک، مرتبہ وٹرن ریویو آفس صفحہ ۵۰، [3] ڈسٹرکٹ گزیٹیر الہ آباد جلد ہشتم مطبوعہ ۱۹۰۳ صفحہ ۲۳۰ وجدید ۱۹۱۱ صفحہ ۲۰۰، [4] تاریخ جہانگیر از پروفیسر بنی پرشاد صفحہ ۱۴۴، [5] مفتاح التواریخ صفحہ ۲۳۳،

یہ نقشہ نامور چابکدست نقاش ومصور طامس دانیال کی صناعی وہنرمندی کا شاہکار ہے اور ڈیڑھ صدی

پہلے کی نقشہ کشی وطباعت کا کارنامہ، پیمانہ بڑا ہے، قرینہ ہے کہ نظری ہوگا لیکن اصل سے بالکل ملتا جلتا ہے اور

اصول پیمایش کے مطابق مانا جاتا ہے، مقبرہ کے پچھم پرانی دیوار اور کنواں بھی مع تماشائیون اور تفریح کرنے والون

کے انبوہ کے اپنی پوری شان وسامان کے ساتھ نظر آتا ہے، شہر وحوالیِ شہر کی مخلوق کا ایک جمِ غفیر پانی پینے کے لئے

ہر قسم کے برتن، پکھالین، اور جانور ہمراہ لے کر امنڈا آتا ہے،

موجودہ حالت مین بھی مقبرہ کا منظر اور اس کا گرد و پیش نہایت دل پسند و دلکش ہے، پچھم جانب وسیع

میدان ہے، لان (LAWN) ہین، پورب کو دو عمارتین ہین، پہلی اسکی بڑی بیٹی سلطان النساء شاہ بیگم کا

خوبصورت گنبد، دوسری اس کے لختِ جگر سلطان خسرو کا مرقد، شمال مین روشین اور کیاریان ہین، اور خیابان

دریامین، کچھ زیرِ زراعت زمین بھی ہے، ہرے بھرے لہلہاتے ہوئے قطعات ہین، دیوار بھی قائم ہے، کنوان بھی مگر

ایک بڑی حد تک بے مصرف، حوض بھی ہین، مگر خشک، سرو کے پودے حال مین لگائے گئے ہین، تاڑ کے دو

پرانے درخت بھی باقی ہیں، معلوم نہیں کس کی رعایتِ ذوق ملحوظ رکھی گئی ہے، کچھ اور سدابہار درخت بھی ہین

ترتیب ونگہداشت کے لحاظ سے بلکہ ہر حیثیت سے کوئی چیز کسی طرح انگشت نمائی کے قابل نہین، اور یون تو ع

کیسی ہی ٹھیک بات ہو حسن کو اختلاف ہے

یہ تعمیر چار فٹ کی بلند کرسی پر کی گئی ہے، عمارت کے سب سے نیچے درجہ کا ہر پہلو اکتالیس گز ہے، اوپر چڑھنے

کے لیے ایک ایک فٹ اونچی تین تین سیڑھیان ہین یعنی آسایش وفراغت کے ساتھ پہنچ جانے کے لئے صدر

دروازہ کے دونون جانب ایک ایک چھوٹا سا زینہ موجود ہے، نیچے اوپر مقبرہ کی تینون منزلین جدا جدا نظر

آتی ہین، مگر یہ ایک ہی بنیاد یا دیوار پر قائم نہیں ہین، بلکہ تینون طبقے یا مرتبے یکے بعد دیگرے بنے ہوئے ہین، مرتبہ اس عہد

کی دفتری وکتابی اصطلاح مین منزل کے معنی مین مستعمل[5] ہوتا تھا، یہ مرتبے مختلف انداز اور جدا جدا عرض وطول

[5] الٰہ آباد کی ہینڈ بک مرتبہ ماڈرن ریویو آفس مین بھی اس کا ذکر ہے، ص ۵۲، [6] جہانگیر نامہ معتمد خانی

کے ہین، پہلے سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا چھوٹا، لمبائی چوڑائی اور بلندی مین کم ہوتا چلا گیا ہے، یہان تک کہ تیسری منزل کی وسعت بقدر معتدبہ اختصار کے ساتھ، نیز اسکی انتہائی بلندی، گنبد اور گنبد کے کلس پر پہنچکر ختم ہو جاتی ہے، فن ڈرائنگ کے ایک ماہر کا ارشاد ہے کہ مقبرہ کا فوٹو ایک مثلث نما چوکھٹے مین بڑی آسانی وخوبی سے آسکتا ہے،

باہر سے دیوارین تمام وکمال سرخی مائل سنگ سفید کی ہین، کہین کہین زرد کھٹو پتھر بھی استعمال ہوا ہے،

نیچے والے طبقہ (منزل) مین دیوارون کے باہر اٹھارہ فٹ چار انچ چوڑا چبوترہ ہے، اس چبوترہ مین تین سمت تو پانچ پانچ سنگین جالیان چار فٹ نو انچ لمبی ایک فٹ چوڑی لگی ہین، چوتھی طرف یعنی دکن کو سامنے کے رخ صرف دو جالیان ہین اور ان کے بیچ مین (صدر کا ایک) دروازہ، سب ملاکر سترہ جالیان ہوئین، یہ جالیان اصول فن پیمائش وتعمیر کے مطابق بنائی گئی ہین، اور روشنی کا اچھا کام دیتی ہین، یہ (داخلہ کا) دروازہ چبوترہ سے گذر کر یعنی چبوترہ کو کاٹتا ہوا بارہ فٹ نو انچ کے فاصلہ پر ملتا ہے، عمارت کے علو ورفعت اور اپنے اطراف وجوانب کی بلندی وشان کے لحاظ سے آجکل تنگ اور نیچا سمجھا جاتا ہے، مگر کیا کیا جائے کہ تین چار سو برس پیشتر یہی صورت پسند ورائج تھی، ہندوانہ تعمیرات مین یہ بات عام پائی جاتی ہے، موجودہ چوکھٹ اور کواڑون کی حالت اُن کی دیرینہ سالی وکہنگی کم ازکم کثرت استعمال پر دلالت کرتی ہے، تختے کمزور، نسبتہً پتلے، قدرے ناہموار اور ناپوست سے ہورہے ہین، بالائے دروازہ محراب کی بلندی اس کی چوڑائی کی مناسبت سے نہین، بلکہ کچھ زیادہ پائی جاتی ہے، اس محراب کے دونون طرف یعنی آمنے سامنے دوسری منزل کو جانے کے لیے غیر مسقف (کھلے ہوے) زینون کی دہری قطارین ہین،

دیوارین پورا بوجھ اٹھانے کے قابل خوب مضبوط، موٹی موٹی، اینٹ اور چونے کی بنائی گئی ہین، تعمیر مین یہ لحاظ رکھا گیا ہے کہ منزل زیرین کے پہلے حصہ کی کھلی چھت دوسری منزل کے لیے چبوترہ کا کام دیتی ہے، اور دوسری منزل کی چھت تیسری یعنی سب سے اوپر والی منزل کے ساتھ کارآمد ہے، اندر کی تیسری دیوار پر دو منزلون کا بار تھا اس لیے وہ زیادہ مستحکم اور عریض ہے، پہلی دیوار صرف تین فٹ سات انچ ہے، دوسری چار فٹ ساڑھے چار انچ، اور تیسری پانچ فٹ نو انچ، دیوارون کا موٹاپا بقدر ضرورت بتدریج بڑھتا گیا ہے، اسی لیے بمقابلہ پہلے

حصے کی دیوار کے دوسرے اور تیسرے حصے کی دیوارین زیادہ چوڑی رکھی گئی ہین، چھت یہان دس فٹ سات انچ بلند رہ جاتی ہے، اس (دوسری) منزل کی دیوارون مین ہر چہار طرف، ہر ضلع کے وسط مین ایک ایک کھلا ہوا دروازہ ہے، ان دروازون مین چوکھٹ بازو نہین ہے، اسکی بغلی دیوارون مین نیچے اوپر دو دو آنکڑے لوہے کے لگے ہین جنکی شکل یہ ہے، قیاس ہوتا ہے، کہ ان قلابون پر کبھی کواڑ رہے ہون گے، یا ان پائیزون پر کواڑ لگانے کا ارادہ رہا ہوگا، مگر تکمیل کی نوبت نہین پہنچی، ہر دروازے کے دونون طرف محرابون کے دو دو نشان بھی ہین، یعنی ہر دیوار مین چار چار، دروازون کی بلندی طے کرنے کے بعد دیوارون پر، ہر آٹھ محرابون کے اوپر آرائش وزیبایش کے لیے پتھر مین کھدے ہوئے معمولی نقش ونگار ہین، ایسے ہر پھول کے گرد، ہر نقش کے ساتھ محرابون سے اوپر خوشنما سنگی حاشیہ نظر افروز ہے، نقشی کارنس کے نیچے پتھر مین جال بنے ہین، یہ کل جگہ خالی اور غیر مکمل سی نظر آتی ہے، حتی کہ دروازون کے خشتی پہلو چونے کے پلاسٹر سے بھی محروم ہین اور پلاسٹر پر قلعی تو کسی جگہ نہین پائی جاتی، صورت حال شاہد ہے کہ شروع ہی سے اس طرف توجہ نہین ہوئی، یا یہ کہ اس منزل کے نیچے شاہزادی دفن تھی اور اس کے اوپر نقلی تربت ہے، اس لیے اس درمیانی طبقہ کو سادہ چھوڑ دیا اور ان بالا وپست درجون کا احترام مدنظر رکھا گیا، حتی الوسع ہر نوع کی آرایش وتکلفات تعمیر سے درگذر کیا گیا ہے، معمولی محرابین اور جدولین کافی سمجھی گئی ہین، دروازے بھی مستقل دروازون کی حیثیت کے نہین بلکہ دیوارون مین مستطیل شگاف نکاس کے لیے ہین، یہ منزل منزل اسفل (نیچی والی) کی چھت یا اندرونی گنبد کے گرد کے اکہرے حصے پر اٹھائی گئی ہے،

تیسری منزل یا مرتبۂ سوم نے پوری عمارت اور اس کے حسن کو انتہا پر پہنچا دیا ہے، یہ بارہ دری آج بھی مجلۂ عروسی یا نیرنگ کمال وجمال ہے، یہ جگہ مربع ہے، ہر طرف تین تین در ہین، بیچ کا در زیادہ فراخ اور کشادہ ہے، باقی دونون دائین بائین کے اس سے کم چوڑے ہین، اوپر ایک خوشنما سبک قبہ ہے، بیگم کی نقلی یا مصنوعی قبر اسی مرمرین مجمر (کٹہرہ) کے اندر بنی ہے، اس سے ایک گز نیچے سنگ سرخ کی غلام گردش ہے

اور اس پر ہموار سطح چھت، غلام گردش کے اوپر پتھر کے صاف ستھرے تختے باہر نکال کر دھوپ اور بوچھار سے بچانے کے لیے چھجا بنا دیا ہے، مقبرہ کا یہ حصہ حسین سے حسین ہے، انگریز ہندسوں[1] (انجینیروں) نے قنوج کے مخدوم جہانیاں کی مسجد کو (جو عہد سلاطین شرقیہ کی یادگار ہے) پتھر پر نقاشی و دستکاری کے لحاظ سے نہایت خوب اور قابل تحسین بتایا اور لاجواب لکھا ہے، لیکن میں عرض کرونگا کہ مقبرۂ شاہ بیگم کے اس حصہ میں جیسا خوب اور باریک و نازک کام نقاشی اور بیل بوٹے کا کیا گیا ہے، مسجد کا کام اس کے مقابلہ میں کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتا، شاید اسکی یہ وجہ معقول ہو کہ مسجد کی تعمیر اس مقبرہ سے دو ڈیڑھ سو برس پیشتر ہوئی تھی، اتنے زمانہ میں زمانہ بہت ترقی کر گیا تھا، اور مغلوں کی سرپرستی اور دستگیری نے سنگ تراشی و نقاشی کے ہنر کو منتہاے کمال پر پہنچا دیا تھا، اس ایوان میں پہنچکر نظر واپس آنا نہیں چاہتی، ع

کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست

قبر کا تابوت، لوح سرہانے، سنگ پائین، ہر چیز مرمر کی اپنی اپنی جگہ بے مثل ہے، تعویذ کے دونوں پہلوؤں پر یہ رباعی جلی حروف میں پاکیزہ نستعلیق میں کندہ ہے، (بائیں جانب، تابوت کے دلے میں)

بیگم کہ ز عصمت رخِ رحمت آراست — اقلیم عدم ز نورِ عزت آراست

(داہنی طرف کے دلے میں)

سبحان اللہ زہے کمال عفت — کز حسنِ عمل چہرۂ جنت آراست

تعویذ پر حسب معمول قلمدان بنا ہے،

لوح مزار شاہزادی کے شایانِ شان، خوب بلند ہے، اس پر یہ کتبہ ہے،

اللہ اکبر

چون چرخ فلک ز گردشِ خود آشفت — در زیر زمین آئینۂ مہ بنہفت

[1] گزیٹر جدید ضلع فرخ آباد،

تاریخِ وفات شاہ بیگم جستم — از غیب ملک بخلد شد بیگم گفت (۱۰۱۲ھ)

لکاتبہ عبد اللہ[1] مشکین قلم، جہانگیر شاہی،

مسٹر بل[2] نے مفتاح التواریخ میں "آئینۂ مہ" کی جگہ "آئینۂ خود" اور مسٹر بیوریج[3] نے اپنے مقالہ میں "آئینۂ مہر" لکھا ہے، مسٹر ڈیو ہرسٹ نے اپنی تحریر[4] میں تصحیح فرما دی ہے، بل صاحب نے پہلی رباعی میں "عزت" کی جگہ "غیرت" لکھا تھا، شاید چھاپے کی غلطی ہو،

باز آمدم، ان پتھروں پر نہایت خوبصورت نستعلیق حروف کندہ ہیں، ہر مصرع کے گرد نفیس بیلیں اور گلکاریاں ہیں، یہ حروف اس قدر باقاعدہ، سڈول، دبیز اور باہر کو ابھرے ہوئے ہیں، کہ آجکل کے موٹے موٹے انگریزی حروف جو ٹین وغیرہ کی چادروں پر ڈھالے جاتے ہیں، ان کے آگے ہیچ معلوم ہوتے ہیں، مرمرین ظرف اور نستعلیق حرف، ع

عروسِ جمیل و لباسِ حریر،

پتھر کے پھولوں پر کوئی روغن سرخی مائل پھرا ہوا تھا جو رفتہ رفتہ ماند ہوتا جاتا ہے، سنگ بالین ایک بلند بالا تختہ مرمر کا، لمبا چوڑا اور خوب موٹا ہے، خوبصورت دلفریب تراشا گیا ہے، اس پر نہایت عمدہ کام ہے، پائین قبر

[1] میر عبد اللہ مشکین قلم دولت جہانگیری کے نامور کاتب و خوشنویس تھے، قلعۂ الہ آباد میں اشوک کے مشہور سنگین ستون پر ہندی عبارت کے نیچے سنہ ۱۰۱۴ھ میں جہانگیر نے اپنا اور اپنے باپ دادا کا نام فارسی میں کندہ کرایا ہے، وہ انہیں کے ہاتھ کا کمال ہے، (مفتاح التواریخ صفحہ ۱۹۷) تبریز کے رہنے والے، شاہ نعمت اللہ مشہور ولی کی اولاد سے تھے، دینی و دنیوی، صوری و معنوی، علوم میں پایۂ بلند رکھتے تھے، "مشکین قلم" دربار جہانگیری سے خطاب ملا تھا، مختلف مقامات پر اکثر بادشاہی کتبے آپکے ہنر و جادو نگاری کی یادگار ہیں، ۱۰۳۵ھ (۱۶۲۵ء) میں رحلت فرمائی، فرزند صالح نے عالیشان مقبرہ آگرہ میں بنوایا تھا، ان کے خاندان میں خوشنویسی پشتہا پشت تک قائم رہی (حیات جلیل حصہ دوم صفحات ۳۰۲، ۳۰۳ - نوٹ) [2] صفحہ ۲۳۳ [3] جرنل ایشیاٹک سوسائٹی جولائی ۱۹۰۷ء صفحہ ۲۰۳ [4] جرنل مذکور بابتہ جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۷۶۶،

کا تختہ بھی ایک ڈال سنگ مرمر کا، سرھانے والے پتھر کے بالکل مشابہ اور ہمشکل ہے، اس پر بھی ویسی ہی نفیس بیلین
اور باریک کام ہے، البتہ کچھ لکھا نہین ہے، یہ سنگ بالین کا ہر لحاظ سے پورا جواب ہے، اور خود لاجواب، یہان
مرمرین دلوون اور تختون پر مختلف اقسام خصوصًا کنار کی بیلین، خوبصورت دوہری تہری ابھری ہوئی نگاہ افروز ہین
کہین کہین کچھ پتھر یا اس کا کوئی ریزہ اکھڑ بھی گیا ہے، مگر ان کے نشانات و داغ زیادہ نمایان نہین، کم ہین اور
خفیف، قبہ، گنبد مختصر و ہندوانہ ہے، جینی وضع سے بہت ملتا جلتا ہوا، جہان ایوان کی دیوارون کی بلندی
ختم ہوجاتی ہے یہین عمارت کے چوکور حصہ سے پتھر کے تختے بڑھتے گھٹتے ہوئے لگاکر، بتدریج اٹھا اٹھا کر، چارون پہلو
کو اوپر یکجا کر ملا دیا ہے، حقیقۃً یہ کوئی برج نما (مدور) یا گنبد نہین ہے بلکہ ایک خاص وضع کی چیز ہے، اس پر
کلس بھی اسی شان کا زرنگار و زراندود مناسب حال چڑھایا گیا تھا، اب بے رونق ہوگیا ہے، اس طبقہ کا قیمتی
اس کا فرش، اس کے مرمرین تختے اور جالیان، اس کے حسین ستون، ان سب پر نازک نقاشیان، غرضکہ اس کا
ہر جزو و کل قابل ناز اور سلاطین تیمور کی عظمت ماضیہ اور صنعت کاملہ کا آئینہ دار ہے،

حکومتون کے انقلاب اور یار و اغیار کی دست درازی و دست برد نے اس کے ساتھ جو کچھ ظلم کیا ہوگا
کس کی زبان بتا سکتی ہے، لیکن امن وامان اور تہذیب و روشنی کے زمانہ مین یعنی ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد عوام
نے جو قدردانی کی اور سیاحون اور زائرین نے جس قدر ضرر پہنچایا، وہ بھی ناقابل تلافی ہے، فرش کے چکنے ہوئے
پتھرون پر بہت سے حضرات نے انگریزی، فارسی، ہندی اور عربی مین اپنے نام نامی اور دستخط گرامی نقش فرما دیے
ہین، کسی مسٹر جیمس نے اپنے نام کے ساتھ ۱۷۶۶ء بھی چاقو سے کھود دیا ہے، شاید یہی سب سے پہلا ظلم اور فتنہ برپا ہوا
تھا جس کی اور لوگون نے تقلید کی ہے،

اوپر کی دونون منزلون کی آپ سیر کر چکے اور اس سے تمام باغ بلکہ حد نظر تک کا لطف اٹھا لیا، آئیے
اب باقی ماندہ، پست ترین طبقہ کو بھی اندر سے دیکھ لیجئے، در اصل یہی منزل، منزل اول ہے زمین پر واقع
ہے، مگر بہت وسیع، فراخ اور کافی روشن ہے، اس کے داخلہ کا دروازہ وہی ایک ہے جس کا ذکر ابتدا

مین آچکا ہے، دروازہ مین قدم رکھتے ہی یہ تہ زمین یا بالائے زمین حصہ عمارت کا شروع ہوجاتا ہے، ایک لمبا
چوڑا، چوکور کمرہ شاہ بیگم کا مدفن ہے، جس پر کسی قدر اٹھی ہوئی محدب چھت ہے، اس کمرہ کے ارد گرد دوہری
دوہری غلام گردشین، طواف کرنے کے لئے خوب لمبی چوڑی بنی ہین یعنی صدر دروازہ سے اندر آکر پوری
وسعت و طوالت کا ایک لمبا سا کمرہ ملتا ہے، اس کے بعد دوسرا دروازہ ہے، اس دروازے کے بعد پھر ویسا
ہی چوڑا چکلا گرد گھا (مطاف) ہے، مگر یہ پہلے سے طول مین کم ہے، ان دونون دروازون سے گذر کر حجرۂ
قبر مین پہنچتے ہین، باقی تین طرف کوئی دروازہ نہین، لیکن روشنی کی شعاعین سنگ سرخ کی سادہ مگر قابل غور
جالیون اور خانون سے ہوکر اندر آتی ہین، یون سمجھ لیجئے کہ پہلی دیوار سے جو تین فٹ سات انچ عریض ہے
اور اس کے دروازے سے اندر داخل ہونے کے بعد اس کنارہ سے اُس کنارہ تک آپ کو پانچ حصے یا کمرے
ملین گے، پہلا دروازہ سے لیکر دوسری دیوار و دروازہ تک، یہ بارہ فٹ چوڑا ہے، اس کے بعد دوسری
دیوار چار فٹ ساڑھے چار انچ موٹی ہے، پر دوسرا کمرہ سات فٹ ساڑھے چار انچ چوڑا، بعد ازان تیسری
دیوار پونے چھ فٹ موٹی، بعد ازان حجرۂ قبر ہے، انیس فٹ مربع، گویا وسطی یا مرکزی کمرہ کے گرد ہر چار
سمت دوہرے درجے ہین، دو داہنے دو بائین، دو سرھانے اور دو پائین، مرکزی حجرہ پر دوسری اور
تیسری منزلین واقع ہین،

قبرون کا تہ خانہ مین بنانا تو ایک مدت دراز سے چلا آتا تھا، لیکن سلطنت مغلیہ کے عروج، یعنی اکبر اور
جہانگیر کے عہد مین اسکو اور بھی ترقی ہوگئی تھی، بالخصوص بیگمات کی تدفین مین، پھر کچھ زمانہ بعد تو دولتمند اور
صاحب مقدرت طبقون مین اسکا رواج عام اور دستور سا ہوگیا، چنانچہ شاہ بیگم کی ساس (اکبر کی پہلی ہندو
بی بی، جہانگیر کی مان) ملکہ مریم زمانی[1] آگرہ کے ایک ایسے ہی مقبرہ مین سو رہی ہے، اس سے بھی روشن اور
شہرت یافتہ مثال ممتاز محل[2] (روضۂ تاج) کی ہے، نیز شاہجہان کی ملکہ قندھاری بیگم کے مدفن کی اس گئی گذری

[1] تاریخ آگرہ از مولوی سعید احمد مارہروی، صفحہ ۱۶۴، [2] ایضاً، صفحات ۱۴۳-۵۰،

حالت میں بھی دہلی و آگرہ میں ایسی زیر زمین قبریں بہ تعداد کثیر موجود ہیں،

شاہ بیگم کا جسد خاکی کسی سنگ و خشت یا صندوق مرمر کے تابوت کے اندر دفن نہیں ہے بلکہ اسکی قبر اینٹ چونے کی سادہ و بے تکلف تعمیر ہے، قبر کے چبوترہ کا طول دس فٹ عرض سات فٹ دو انچ ہے، قبر کا تابوت یعنی اونچا حصہ پانچ فٹ پانچ انچ لمبا، دو فٹ پانچ انچ چوڑا ہے، قبر کے چبوترہ کی بلندی ایک فٹ ایک انچ ہے، اور تعویذ کی ایک فٹ چار انچ، دونوں کی ملاکر دو فٹ پانچ انچ ہوئی، اسکی چھت کسی قدر پست گو محدب ہے، چاروں دیواروں کے پہلوؤں کو کچھ کچھ اٹھا کر اوپر ملا کر پاٹ دیا گیا ہے، آپ چاہیں تو اس کو نیم گنبد کہہ سکتے ہیں، شاید ایک تہ خانہ یعنی زمین دوز حصہ عمارت کے لیے یہی مناسب و کافی تھا، اس پورے طبقۂ زیرین میں معمولی پتھر کے چوکوں کا ہموار صاف ستھرا فرش ہے، کثرت استعمال و پامالی سے چکنا بھی ہو گیا ہے، ایک وسیع مسقف رقبہ میں ایسا فرش نہایت اچھا پیروں کے لیے آرام دہ اور آنکھوں کیلئے راحت بخش ثابت ہوتا ہے، شاید یہ درجہ کبھی چاروں طرف سے بند رہا ہوگا، جیسا کہ مسٹر بیل نے لکھا ہے، اور منافذ اور جھنجریوں سے روشنی کا بقدر قلیل انتظام ہوگا، مفتاح التواریخ[2] کے الفاظ یہ ہیں: "اصل تربت او اندرون روضہ ہست و آن مسدود است از ہر چہار طرف" بظاہر اسکی تعبیر دشوار ہے، اور اگر آمد و رفت کے اعتبار سے بند ہونا مراد ہو تو چاروں طرف سے مسدود ہونا کیا معنی رکھتا ہے، ایک دکن رخ تو دروازہ ضرور کھلا ہوا موجود ہے، بہر کیف اب کوئی بگڑی ہوئی کیفیت باقی نہیں، غالباً اصلی حالت میں تبدیل کر دی گئی ہے، ممکن ہے کہ یہاں کبھی نقش و نگار یا رنگینیاں رہی ہوں، مگر اس وقت سفیدی اور چونے کی تہوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، چھت کی استرکاری میں البتہ کچھ جدولیں، اور دائرہ بناتے ہوئے جال در جال پیدا کر دیئے گئے ہیں، اور وہ خوشنما ہیں،

بیگم کی گود جس طرح جیتے جی بھری پری رہی، اسی طرح آج بھی ہے، انکی آغوش یا دامان عاطفت میں کئی بچے کھیل رہے ہیں اور قبر کے پہلوؤں اور نیچی حصوں کو آباد کئے ہوئے ہیں، اس کی قبر کے پاس داہنے کو

۱؎ تاریخ آگرہ صفحات ۵۰، ۹۰، ۹۲، ۹۴، ۱۰۲، ۱۴۲، ۱۴۸، ۱۵۳، ۲؎ ص ۳۳۵

دو چھوٹی چھوٹی قبریں ہیں، جس کے بعد اینٹ کی جالی سے ادھر کا دروازہ بند کر دیا ہے، بائیں طرف بھی دو ہیں، دوسرے درجے میں، اسی طرح پر بائیں طرف دو قبریں چھوٹی چھوٹی برابر کو ہیں، اور تین قبریں کسی قدر ہٹ کر، تیسرے درجہ میں ایک معمولی چبوترہ اینٹوں کا نظر آتا ہے، جو تقریباً ایک گز مربع اور ایک بالشت اونچی ہوگا،

"بجلد رشد بیگم" سے ۱۰۱۲ عدد نکلتے ہیں جو سنگ بالین پر مرقوم ہے، مسٹر بیل اپنی اورینٹل بیا گرافیکل ڈکشنری[1] میں ۱۰۱۲ھ - ۱۶۰۳ع لکھتے ہیں، تزک[2] میں سال وفات ۱۰۱۳ھ چھپا ہے، ممکن ہے کہ ٹائپ کی غلطی ہو، مسٹر بیورج کی رائے[3] ہے، کہ تزک کی مندرجہ تاریخ یعنی ۲۶ ماہ گذشتہ ۱۰۱۳ھ، ۶ مئی ۱۶۰۵ء کے مطابق ہوتی ہے، غالباً خود جہانگیر یا اس کے نقل کنندہ و کاتب سے ایک سال بڑھ گیا ہے، صحیح تاریخ ۲۶ ذی الحجہ ۱۰۱۲ھ یا ۱۶ مئی ۱۶۰۳ء ہے، اکبر نامہ سے بھی یہی سال پایا جاتا ہے،

ڈاکٹر فوہرر شاہ بیگم کا سال وفات ۱۰۱۲ھ لکھتے ہیں[4]، وہ محکمۂ آثار قدیمہ کے سب سے بڑے افسر تھے، انکی کتاب یادگار ہائے قدیم پر سرکاری استناد، سرکاری حکم اور سرکاری خرچ سے سرکاری مطبع میں چھپی، یہ مقبرہ اور اس کا کتبہ ان کی نگرانی اور سایۂ عاطفت میں تھا، ان سے ایسی غلطی کا سرزد ہونا تعجب سے خالی نہیں،

کرنیل نیول ڈسٹرکٹ گزیٹر جدید[5] میں ارقام فرماتے ہیں، کہ، کتبہ سے سال وفات ۱۶۲۱ معلوم ہوتا ہے، گزیٹروں کے فاضل مولف بھی انسان ہیں، باوجود وسعت نظر و تحقیق اور قابل معاونین کی ایک جماعت کے ان کا قلم بھی کبھی کبھی فاش غلط نگاریاں کر جاتا ہے، ان کا یہ لکھنا کہ خسرو کی ماں کا سال وفات ۱۶۲۱ معلوم ہوتا ہے، ایک فاحش غلطی ہے، "معلوم ہوتا ہے" کے معمولی فلسفیانہ و ادیبانہ عذر کے لکھ دینے سے ان کی ذمہ داری و جوابدہی ان کو سبکدوش نہیں کرتی، اس شاہزادی نے ۲۶ ذی الحجہ ۱۰۱۲ھ کو وفات

۱؎ صفحہ ۱۵۲، ۲؎ صفحہ ۲۶، ۳؎ جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی، جولائی ۱۹۰۷ء، صفحہ ۶۰۳،

۴؎ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا سلسلۂ جدیدہ، جلد دوم، صنادید قدیمہ اور کتبے، صفحہ ۱۳۰،

۵؎ صفحہ ۱۶۹، گزیٹر سابق، صفحہ ۲۰۳،

بانی تھی جو تمام تقاویم موجودہ ورائجہ کے حساب سے ۶؍ مئی ۱۶۰۴ء کے مطابق ہے، قطعۂ تاریخ اور اسکی نقل آپکے سامنے موجود تھی، ۱۰۱۲ھ یکم جون ۱۶۰۳ء سے شروع ہو کر ۱۹؍ مئی ۱۶۰۴ء کو ختم ہوا، ۱۶۲۱ء کا پہلا دن ۱۵؍ صفر ۱۰۳۰ھ کے مطابق تھا، پندرہ برس کا تفاوت! قیاس چاہتا ہے کہ غلطی سے ماں کے سالِ وفات کے بجائے بیٹے کا لکھ گیا ہو، اس لئے کہ سلطان خسرو آخر جنوری یا شروع فروری ۱۶۲۲ء میں فوت ہوا تھا، اور ۱۰۳۱ھ کا آغاز ۶؍ نومبر ۱۶۲۱ء کو اور اختتام ۵؍ اکتوبر ۱۶۲۲ء کو ہوتا ہے، بعض اوقات ایک تقویم سے دوسری میں تحویل کرتے وقت مہینوں یا دنوں کا فرق ناگزیر یا ناقابلِ لحاظ سمجھا جاتا تھا،

صفحاتِ تاریخ بتاتے ہیں کہ مغلوں کے محلات میں آنے والی ہندوستانی شاہزادیوں میں مان بائی (شاہ بیگم) سب پہلی رانی تھی جس نے حرم سرائے سلطانی میں جان دی اور اپنے شوہر پر نثار و تصدق ہو گئی، تیمور کے پوتے نے بھی نیازمندیٔ وفا کا حق ادا کیا اور اس کے جسدِ خاکی کی ابدی آسایش کے لئے دامنِ فردوس میں ایک قابلِ رشک نشیمن مہیا کر دیا، اسکا مقبرہ جس اہتمام و لطافت اور تعمیری و نسوانی رعایتوں کے ساتھ اس سرسبز و سدا بہار چمن کی آغوش میں تیار کرایا گیا، اس کے شایانِ شان تھا، مغلوں کے بہت سے شاندار مقبرے اور مدفن میں نے آگرہ اور دہلی میں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر دیکھے ہیں، لیکن شاہ بیگم کے مقبرے کو بے تکلف و تامل اور بلا خوف تردید ان کے سلیقۂ تعمیر کا حسین ترین نمونہ اور خوشنمائی و نزاکت کا مجسمہ کہہ سکتا ہوں، اس کی سادگی و نظرفریبی مسلّم ہے، ساتھ ہی جدتِ وضع، اندازِ تعمیر اور مجموعی اختصار نے جو خوبی و رعنائی پیدا کر دی ہے، اسکی دادِ تحسین مجھ ناشناس کی آنکھیں کیا دے سکتی ہیں، میں نے ایک بالغ نظر کو اس وجہ خاص سے اسکو تاج پر بھی فوقیت و ترجیح دیتے دیکھا ہے،

ایک عورت کے روضہ کی تعمیر میں خصوصیت یا صفت اسکی نسوانیت کو ہونا چاہئے، اگر اکبری دور کے تعمیرات کا سا مردانہ پن، استواری و استحکام کی نمایش اور اہتمام اس میں بھی کیا جاتا تو لطافت و نزاکت، دلکشی و دلربائی خواہ مخواہ مفقود یا نظرانداز ہو جاتی، یہ نسوانیت یہاں ارادۃً پیدا کی گئی ہے اور بدرجۂ اتم زیب دے رہی ہے

یوں کہئے کہ روضہ کی عمارت محض روضہ نہیں بلکہ شاہ بیگم اپنی بہارِ حسن و جمال کے ساتھ اس رشکِ فردوس مقام پر جلوہ افروز ہے، پھر یہ اسکی انتہائی خوبی ہے کہ صبحِ درخشاں ہو یا نیمروزِ تاباں، شام کا دھندلکا ہو یا رات کی گھنگھور سیاہی، یہاں رانی اپنی اترتی یا ڈھلتی ہوئی جوانی میں نہیں، بلکہ چڑھتے ہوئے شباب میں رونق بخش نظر آتی ہے،

میں نے جب اپنی جوانی اور نئی عمر میں اس کو پہلے پہل دیکھا تھا تو اپنے نزدیک فیصلہ کر لیا تھا کہ جہانگیر نے یہ خوبصورت اور نازک یادگار بنا کر بیگم کی مہر و وفا کا صلہ یا حقیقۃً اپنا خراجِ عشق ادا کیا ہے اولوالعزم شاہجہان نے بلند حوصلگی کے ساتھ ممتاز محل کا روضہ بنوانے میں محض باپ کی تقلید یا پیروی کی ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ اپنے سپوت ہونے کا ثبوت دیا ہے،

نگارندۂ سطور، عبرت و وفا کا سبق حاصل کرنے شاہ بیگم کے مرقد پر بارہا گیا، اور زبانِ حال سے کسی کی غفلت و بے خبری کا شکوہ سنج پایا ہے،

برمزارِ ما غریبان، نے چراغے، نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد، نے صدائے بلبلے

گجراتی زبان اور اوسکی تاریخ،

(ماخوذ از تاریخ گجرات زیر ترتیب مولوی سید ابو ظفر صاحب ندوی)

(۳)

گجراتی لٹریچر دو خاص عہدون مین تقسیم ہے (۱) عہد جدید (۲) عہد قدیم، عہد قدیم کا زمانہ پندرہوین صدی سے انیسوین صدی تک ہے اور عہد جدید کی ابتدا انیسوین صدی سے ہوتی ہے، عہد جدید کی خصوصیت یہ ہے کہ جو شاعر اس زمانہ مین گذرا وہ ایک خاص مذہبی خیال کی جماعت سے تعلق رکھتا تھا، جو طالب علم ان کی تصانیف کا مطالعہ کرے اوس کو چاہئے کہ سب سے پہلے وہ مختلف جماعتون کا مطالعہ کرے اور اون کے مختلف عقائد کو سمجھے، ان شاعرون کا پوری طور سے مطالعہ اسوقت ممکن ہوسکتا ہے جب ہم اون مختلف جماعتون سے پوری طور پر واقف ہوجائین جن سے وہ متعلق تھے، اگر ہمارے پاس اس کے متعلق کامل معلومات نہ ہون تو ہم ان شاعرون مین سے کسی شاعر کے ساتھ انصاف نہین کرسکتے ہین، ہم اپنے قدیم شاعرون کا مناسب طریقے سے مطالعہ اُسی وقت کرسکتے ہین جب کہ ہم شاعر کو سمجھین اور اوس کی جماعت کے عقائد پر احتراماً غور کرین، اگر ہم کسی تعصب کے ماتحت ایسا کام کرین، تو ہم ضرور اون کے ساتھ بے انصافی کرین گے، "نرسنگھ" کو سمجھنے کے لئے یہ لازمی ہے، کہ وشنو جماعت کے متعلق واقفیت حاصل کرین، اور میران کی پیروی کرنے کے لئے ہمین میران جیسا بننا چاہئے،

عہد قدیم کا سب سے آخر شاعر اور گجرات کا ایک بہترین شاعر ہمارا رنگیلا دیارام شاعر تھا، دیارام کی زندگی کے متعلق مختلف روایات ہین بعض کہتے ہین، کہ وہ اخلاقی مجرم تھا، اور اس کی شہادت اوس کی تصانیف سے ملتی ہے جنہین وہ عشق کے جذبات کو علانیہ بغیر اخلاق کے معمولی قواعد کی پابندی کے بیان کرتا ہے اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ جوانی مین وہ بہت شریر تھا، وہ چاندود کا رہنے والا تھا، چاندود ہندوؤن کی جاترا کی جگہ ہے اور نمادا (؟) کے کنارے واقع ہے، دیارام کو اس سے خاص مسرت ہوتی تھی

کہ وہ ان عورتون پر جو نمادا کے کنارے پانی لینے آتی تھین، پتھر پھینکے اور شرارت کرے، ایک روز اوس نے ایک سنار کی عورت کو چھیڑا، اور نتیجہ یہ ہوا کہ اوسے تیر کر پاس کے گاؤن کرنالی مین بھاگ جانا پڑا، وہان ایک سادھو کسوانند سے ملاقات ہوئی اور وہ ایسے شریر اور بدمعاش کو اپنا چیلا نہین بنانا چاہتا تھا، مگر آخر کار کسوانند نے اُسے اپنا چیلا بنالیا، دیارام اس سے بہت خوش ہوا، اور اوس نے، یہ پاڈا گایا، گرو بڑا ہی، گرو بڑا ہے، دیارام فطری شاعر تھا، وہ بچپن ہی سے چھوٹی چھوٹی نظمین لکھ لیا کرتا تھا، کہا جاتا ہے کہ اوس نے اپنی جوانی کے زمانہ مین چند "پاڈے" نظم کئے تھے، جو اخلاق سے گرے ہوے تھے، اوس نے کبھی شادی نہ کی، اور بوڑھا ہو کر مجردی حالت مین مرگیا، ہندوستان کے مقدس مقامات کی پیدل جاکر زیارت کی جس سے اوسے مختلف تجربات حاصل ہوے، بنارس مین اوس نے کاشی وشو نشور کی تعریف مین ایک کتاب لکھی، وہ ہندوستان کے تمام صوبون کی زبانون سے واقف تھا، وہ بہت حسین اور دلفریب تھا، اوس کی آواز مین شیرینی تھی، وہ وشنو جماعت سے تعلق رکھتا تھا، اُس کے گربے "بہترین اور مقبول گربے" کا مضمون نسوانی جذبات کے ذریعہ شری کرشن کی پرارتھنا ہے، دیارام کے گربے مین عشق کے جذبات کا غلبہ ہوتا ہے، لیکن چونکہ گربے کا مضمون عبادت ہے، اس لئے اسے لڑکی اپنی مان کے سامنے بغیر روک ٹوک کے گاسکتی ہے، دیارام کے گربے مشہور و معروف ہین، یہ دیکھنا مناسب نہیں ہے کہ اس کا چال چلن بے داغ تھا، یا نہین، لیکن خدا کے ساتھ اس کا عقیدہ بہت زیادہ تھا، اس کا گرو اچھا کارام بھٹ اُسے نرسنگھ کا دوسرا اوتار کہتا تھا، اس کی تصانیف کئی ہین، اوس کی زبان شیرین اور دلفریب ہے، اس کا طرز تحریر بہت صاف ہے، وہ خود مختار اور صداقت شعار تھا، اس کی فطرت کی جھلک اس کی نظمون مین پائی جاتی ہے، وہ گجرات کا بلبل کہلاتا تھا اور عہد قدیم کا بہترین شاعر تھا،

عہد جدید کا آغاز دیارام کے بعد سے ہوتا ہے، اس عہد کے بعد برطانوی حکومت مضبوطی کے ساتھ قائم ہوچکی تھی، شورید، مرہٹے گجرات سے چلے گئے تھے، مغربی تعلیم کی ابتدا ہورہی تھی بمبئی یونیورسٹی قائم کی گئی تھی، گجرات کے پایۂ تخت احمدآباد مین بھی تعلیم پھیل چلی تھی، بعض لٹریری ریسرچ (تحقیقات) بھی کی گئی تھی انگریز مشنریون کی مدد سے گجراتی زبان کے قواعد لکھے گئے تھے احمدآباد مین گجرات ورنیکلر سوسائٹی قائم کیگئی تھی شاعر دلپت رام ڈایا بھائی اس سوسائٹی کا خاص تنظیم کرنے والا تھا، وہ

عہد جدید کا پہلا اور خاص شاعر ہے، مذہب جو شاعری کا مرکز تھا، بدل دیا گیا تھا، اب شاعری کے مضمون میں انسانی زندگی کے تمام مختلف پہلو دکھائے جاتے تھے، نرمد اشنکر جو دلپت رام کا معصر تھا، سورت شہر میں ۱۸۳۳ء ۱۸۸۶ء میں گذرا تھا، یہ دونون شاعر لٹریچر کے میدان میں ایک دوسرے کے حریف تھے، اس کا لازمی نتیجہ ادبی مباحثے تھے، جو ساحل اور دولہہ جیسے تو نہ تھے، لیکن کچھ کچھ ویسے ہی تھے، ان بحث و مباحث سے سوسائٹی کو بہت فائدہ ہوا، دلپت رام پرانے سخت مذہبی نظام سے تعلق رکھتا تھا، اور نرمد اشنکر ایک نوجوان بت شکن اور سوسائٹی کی اصلاح کرنے والا تھا، اوس نے کچھ انگریزی تعلیم حاصل کر لی تھی، نرمد اشنکر کو ہر ایک پرانی چیز سے نفرت تھی، یہ دو برابر کے لیکن ایک دوسرے کی رقیب قوتیں ایک دوسرے سے جنگ کرتی تھیں، ان شاعرون کے مزاج اور فطرت کا عکس ان کی تصانیف میں نمایان ہے، دلپت رام ارتقا پر عقیدہ رکھتا تھا، اور نرمد اشنکر سوسائٹی کی اصلاح و بہبودی کے کام میں انقلابی خیال رکھتا تھا، اور چاہتا تھا کہ ذات پات کے نظام کا ایک ہی وار میں کام تمام کر دے، دلپت رام اس بات کا سبق دیتا تھا، کہ سوسائٹی کی ترقی کے کام کو آہستہ آہستہ اور بتدریج کرنا چاہیے، اس دیرپا جنگ سے لٹریچر پر بہت فائدہ مند اثر ہوا،

نرمد اشنکر اور دلپت رام گجراتی لٹریچر کے قابل احترام شاعر کہلائے جانے لگے، دلپت رام نے ہمارے لٹریچر میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے، اوس کی زبان سنجیدہ، متین، معمولی، ظریف، اور پُر معنی ہے، اس کے "دُہرے" اور "چاندے" اس بات کے ثبوت ہیں، اوس نے ہمیں چند گربے بھی دئے ہیں، اوس پر خدا کی طرف سے ایک عجیب بخشش تھی، کہ وہ "پادون" فی البدیہہ کہہ دیا کرتا تھا، بحیثیت ایک آدمی کے وہ سادہ مزاج اور وفادار تھا، اور حکومت اور عوام دونون اوس سے محبت کرتے تھے، نرمد اشنکر خود مضطرب اور تخیل رکھنے والا اور مصلح تھا، اور بحیثیت ایک شاعر کے نوجوان طبقہ اوسے بہت پسند کرتا تھا، اوس کی شاعری میں زور ہے، اور اوس کے دیراس میں شجاعت کے جذبات ہمیں بہادر بناتے ہیں، اُس کا خیال تھا، کہ کام کو شروع کرنے کے بعد بہر حال اُسے ختم کرنا چاہیے، نرمد اشنکر ہی پہلا شخص ہے جس نے گجراتی لٹریچر میں نثر کی ابتدا کی، اور وطن سے اوسے بہت محبت تھی، اوس کی نظم بعنوان "اے باوقار گجرات تیری فتح ہو" بطور ایک قومی ترانہ کے پیش کیجا سکتی ہے، نرمد اشنکر پہلا شخص تھا، جس نے گجراتی ڈکشنری (لغت) لکھی تھی، بھولا ناتھ سارا بائی

نے گجراتی لٹریچر میں ایشور بھگتی (خدا کی عبادت) کی نظمیں لکھنے کی پہلے پہل بنا ڈالی تھی،

کیا کوئی ایسا گجراتی ہے، جس نے "لاٹھی" واقع (کاٹھیاواڑ) کے ٹھاکر صاحب شری سورسنگھ گوہی کا نام نہیں سنا، صرف وہی ایک ایسی مثال ہے، جو بادشاہ بھی تھا اور شاعر بھی، اس کا تخلص "کلاپی" تھا، اس کی موسیقی کی آواز ایسی ہی شیرین تھی جیسے برسات کے موسم میں کسی مست اور بے رفیق طاؤس کی، اس کے زمانہ میں بہت سے نئے اور مختلف عناصر گجراتی لٹریچر میں داخل کئے جا رہے تھے، گجرات میں انگریزی تعلیم کے جاری ہونے سے رفتہ رفتہ انگریزی زبان کی خصوصیات بھی ہمارے لٹریچر میں داخل ہوتے جاتے تھے، اب تک شاعری کا نفس مضمون عشق الٰہی تھا، "کلاپی" نے اپنی نظموں میں دنیاوی عشق داخل کر دیا، کلاپی نوجوانون اور طالب علمون کا مقبول شاعر ہے، اس کی نظمیں عشقیہ جذبات (پریم رس) سے پُر ہوتی ہین، ان خطوط مین جو اوس نے اپنے دوستون کو لکھے ہین، ادبی چاشنی ہے، اور وہ بہت اچھے ہین، وہ شاعر کے بہ نسبت عاشق مزاج زیادہ ہے، اوس کی نظمین ذاتی تجربہ کے حُسن سے رنگی ہوئی ہین، اس کی خوش قسمتی تھی، کہ اس کے حلقۂ احباب مین بہترین لٹریری اشخاص تھے، منی لال ناتھو بھائی، درویدی ساملداس کالج بھاونگر مین سنسکرت کا پروفیسر تھا، اوس نے بہت سے مضامین لکھے ہین، اور اُن مین سے ایک مضمون جو اوس نے کیرکٹر پر لکھا ہے، قابل توجہ ہے، پریمانند کے تماشون کو چھوڑ کر ہم یہ کہہ سکتے ہین، کہ اب تک گجراتی مین ڈرامون کا لٹریچر نہ تھا، اس کا ڈرامہ "کانتا" گجراتی ڈرامون مین سے ہے، اوس نے بہت سے سنسکرت ڈرامون مثلاً "اُتر رام چرتر" "شکونتلا" وغیرہ کا ترجمہ کیا ہے، اوس نے بہت سے فلسفیانہ مضامین بھی لکھے ہین، وہ گو سنسکرت کا پروفیسر تھا، لیکن اوس نے غزل لکھنے کا تتبع، فارسی الفاظ کو گجراتی الفاظ مین استعمال کر کے نہایت کامیابی کے ساتھ کیا ہے، مثلاً "امید لاکھون ناکامیون کے اندر پوشیدہ ہے، زخم معشوق کے خنجر کے اندر چھپا ہوا ہے، مین نے جدائی کے ایام آہ و زاری اور اشک بہا بہا کر گذار دئے ہین، اگر میرے حلق پر خنجر بھی چل جائے، پھر بھی وصال کی تمنا مجھ سے جدا نہ ہوگی"،

گووردھن مادھورام ترپاٹھی گجراتی لٹریری کانفرنس کا پہلا پریسیڈنٹ گجراتی مصنفون مین نہایت ممتاز جگہ رکھتا ہے، وہ ایل ایل بی، اور نادیاد (نڈیاد) کا ناگر برہمن تھا، وہ گجراتی، سنسکرت اور انگریزی کا بہت ہی پُر شوق

طالب علم تھا، اس وقت گجراتی زبان عجب حالت مین سے گذر رہی تھی، تین اور عالم اشخاص کی تو یہ کوشش تھی، کہ گجراتی کو سنسکرت کے ساتھ ملا دیا جائے، اور نئے تعلیم یافتہ نوجوان اس بات کیلئے انتہائی کوشان تھے، کہ گجراتی کو انگریزی کے زیر اثر لے آئین، گوردھن نے اس رسہ کشی کو بہت کامیابی کے ساتھ طے کر دیا، اس نے خوبصورتی کے ساتھ تینون زبانون سنسکرت، انگلش، اور انگریزی کی خصوصیات کو اختیار کرکے اُن کو باہم ملا دیا، اُس کا آخری ناول "سرسوتی چندر" گجراتی لٹریچر مین بہترین تصنیف ہے، وہ چار حصون مین شائع کی گئی ہے، گوردھن نے اپنے علم کے خزانہ کو اسی تصنیف مین ختم کر دیا ہے، اس کے کیرکٹر نہایت اعلیٰ ہین، وہ ایک بڑے متوسط درجہ کے تعلیم یافتہ خاندان کا معاشرتی ناول ہے، ہم اس کے کمود، اور (ہیروین) "کسم" (اسکی بہن) اس کے سرسوتی چندر (ہیرو) وشنو داد، بدھی دان وغیرہ، کو اپنی باطنی نظر کے سامنے دیکھتے ہین، اس ناول کا گجراتی سوسائٹی پر بہت ہی اچھا اثر ہوا ہے، المختصر گجراتی سوسائٹی مثل سرسوتی چندر بن گئی ہے، اس نے گجراتی کے بڑے بڑے شاعرون کی زندگی پر انگریزی مین بعض مضامین لکھے ہین، علاوہ ازین اوس نے اپنی نظمون کا مجموعہ شائع کیا ہے، جس کا نام محبت کی انگشتری (سنیہ مدرا) رکھا ہے، اس کے نثر کا تتبع بہت کیا جاتا ہے، ۱۹۰۷ء مین وہ مر گیا،

اب ہم اپنے زمانہ مین پہنچ گئے ہین، اس زمانہ کے موجودہ گجراتی شاعرون اور مصنفون کی نسبت اگر کچھ لکھا جائے تو شاید ہمارا مضمون قابل اعتراض بن جائے، اس لئے ہم ان کو آیندہ مورخ کے حوالہ کرتے ہین، تاہم ختم کرنے سے پہلے گجراتی لٹریچر کی موجودہ حالت کے متعلق مختصر طور پر ضرور کچھ کہین گے، گجراتی زبان کو بہت ترقی کر گئی ہے، کئی ماہواری رسالے شائع ہوتے ہین، کالجون مین بھی گجراتی پڑھائی جاتی ہے، گجراتی لٹریچر کے تمام شعبون پر کئی عالم لکھنے والے ہین ناول بھی لکھے جاتے ہین، کنھیالال منشی اور نرائن ٹھکر جنذب ناول لکھتے ہین، نثر کا لٹریچر بھی بہت صاف، سادہ اور شائستہ ہے، آج زبان کی سادگی نے لٹریچر مین مستقل جگہ حاصل کر لی ہے، تصنع کے بجائے سادگی ہے، عدم تعاون کی تحریک نے بہت قابل لکھنے والے پیدا کر دیئے ہین، یا دوسرے الفاظ مین یہ کہ اس تحریک نے ہمارے لٹریچر پر نئی روشنی ڈالی ہے، اس نئی طرز کے خاص لکھنے والے تحریک کے روح رواں، ہمارے بزرگ اور محترم مہاتما گاندھی جی ہین، انکل

کے نثر لکھنے والون مین یہ سب سے اول ہین، جس طرح اون کی زندگی پاک سادہ اور عبادت گذار ہے، اسی طرح ان کی زبان بھی پاک، صاف سادہ اور شگفتہ ہے، اونھون نے گجراتی نثر مین ایک نئی شاخ لگائی ہے،

شاعری بھی اعلیٰ بلندی پر پہنچ گئی ہے، دلپت رام شاعر کا قابل فرزند نہنالال آج کل لٹریری آسمان کا چاند ہے جس سے بہت سے متبدی مستفید ہوتے ہین، وہ بہترین شاعرون مین سے ہے، اس کی نظمین چاندنی رات کے مانند حسین اور دلفریب ہین، اوس نے بھی شاعری مین نئی شاخ لگائی ہے، اسکی نظمون کی خصوصیات "بلینک ورس" ہے، اسکے ڈرامے بھی اوسی طرز مین لکھے جاتے ہین، اس کے گربے گجرات مین بہت مشہور ہین،

اردشیر فرامجی خبردار ایک اور شاعر ہے[1]، جو گو پارسی ہے، مگر اس کی نظمین پاکیزہ اور ادبی ہوتی ہین، حب وطن پر اُس کی نظمون نے گجراتیون کے قلوب مین جگہ کر لی ہے، پروفیسر بلونت رائے، کلیان رائے، ٹھاکور کی عالمانہ اور فلسفیانہ نظمین اعلیٰ سوسائٹی مین پڑھی جاتی ہین، نرسنہراؤ، بھولا بھائی، ڈہی ودے، تیاگو، جدید انگریزی کو گجراتی شاعری کے ساتھ مدغم کرنے مین کامیابی ہوئی ہے، اسکی وہ نظمین جو فطرت کی تعریف مین لکھی گئی ہین، بہت خوشی کے ساتھ پڑھی جاتی ہین، ان نامون کے علاوہ چھوٹے چھوٹے شاعرون کی ایک کثیر تعداد گجرات کے گلستان مین چہل قدمی کر رہی ہے، تراجم سے بھی گجرات کے لٹریچر مین دوسری زبانون کی خصوصیات کا اضافہ ہو رہا ہے، دیوان بہادر کیشولال، ہرشد لال دھروو کے "مرودشک"، "شکونتل"، وغیرہ سنسکرت کے بعض عالمانہ تراجم ہین، پروفیسر دھروو ایک بہت بڑا نقاد اور رجسٹرار ہے، (بنارس ہندو یونیورسٹی کے) پروفیسر آنند شنکر دھروو بھی سنسکرت کے ایک بڑے عالم ہین، وہ ادبی رسالہ "وسنت" کے مدیر اور مشہور نقاد ہین،

مختلف صوبون کی زبانون مثل بنگالی، مرہٹی وغیرہ کے مطالعہ کا رواج گجرات مین ہو چلا ہے، ان زبانون کی خصوصیات بھی گجراتی مین داخل کیجا رہی ہین، علاوہ سائنس اور تاریخ کے علوم مین بھی کافی تحقیقات اور جد وجہد کی گئی ہے، ابھی حال مین ایک انسائیکلوپیڈیا بھی لکھی جا رہی ہے، جس سے زبان کو بے انتہا فائدہ پہنچے گا،

[1] عرف عام مین اس کا نام اردشیر اور تخلص کبردار کہلاتا ہے،

مندرجہ ذیل شعرا گجراتی زبان کے پیدا ہوے، جنکو گجرات میں کافی مقبولیت ہوئی،

(۱) نرسینہ مہتا، جوناگڈھی، متولد ۱۴۱۳ء،

(۲) میران بائی، (میواڑ) ۱۴۰۳ء–۱۴۷۰ء،

(۳) بھالن ۱۴۳۵ء–۱۵۲۹ء،

(۴) اکھا ۱۶۴۹ء

(۵) پریمانند، بڑودہ کا باشندہ تھا، ۱۶۳۶ء میں پیدا ہوا، اور ۱۷۳۴ء میں فوت ہوا،

(۶) سامل احمد آباد کا رہنے والا تھا، ۱۷۰۰ء میں پیدا ہوا اور ۱۷۶۵ء میں انتقال کرگیا

(۷) دیارام ڈبھوئی میں قیام رکھتا تھا، ۱۷۷۷ء میں پیدا ہوا، بڑا فاضل تھا، چودہ زبان کا عالم تھا، ۱۸۵۲ء میں فوت ہوا،

(۸) دلپت رام اصل وطن آباو اجداد کا بھیلمان تھا، پھر کاٹھیاواڑ میں آکر بسے اس کے بعد احمد آباد چلے آئے، ۱۸۲۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۹۸ء میں اس فانی دنیا کو خیرباد کہا، ان کا لڑکا بھی گجرات کا اسوقت بہترین شاعر ہے،

(۹) نرمدا شنکر ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوا، سورت ان کا مسکن تھا، ۱۸۸۶ء میں چل بسے،

(۱۰) نند شنکر ۱۸۳۵ء میں اس جہان میں آئے اور ۱۹۰۵ء میں یہاں سے کوچ کرگئے، یہ سورت کے باشندے تھے،

(۱۱) نول رام، انکی ولادت سورت میں ہوئی ۱۸۳۶ء،

(۱۲) نبھو بھائی ۱۸۴۰ء میں تولد ہوا اور ۱۹۲۳ء میں انتقال کیا،

(۱۳) جگجیون لال اندرجی ذاکر ۱۸۴۰ء میں انکی ولادت ہوئی ۱۸۹۳ء میں وفات پائی،

(۱۴) منسکھ رام ۱۸۴۰ء میں اس باکمال نے دنیا میں قدم رکھا، یہ گجرات کا فردوسی ہے، اپنے اشعار میں غیرکی زبان سے بے حد احتراز کرتا ہے، اور خالص گجرات کی زبان استعمال کرتا ہے، فارسی، عربی وغیرہ کے الفاظ مشکل سے اس کے اشعار میں ملیں گے، ۱۹۰۷ء میں اوس نے دنیا کو وداع کیا،

(۱۵) کے خسرو کابراجی ۱۸۴۲ء میں پیدائش ہے، اور ۱۹۰۴ء کو راہی ملک عدم ہوئے،

(۱۶) واگ جی ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے، اور ۱۸۹۶ء میں وفات پائی،

(۱۷) نارائن ہیم چندر ۱۸۵۵ء،

(۱۸) گوردھن رام ۱۸۵۵ء میں پیدائش ہوئی، اپنے وقت کے اہل کمال میں ان کا شمار ہے ۱۹۰۶ء میں اس جہان سے رخصت ہوئے،

(۱۵) ہری لال، متولد ۱۸۵۶ء، متوفی ۱۸۹۶ء،

(۲۰) منی لال نبھو بھائی ۱۸۵۸ء متوفی ۱۸۹۸ء،

(۲۱) بالاشنکر ۱۸۵۵ء–۱۸۹۸ء،

(۲۲) انبالال شاکرلال ۱۸۴۴ء،

(۲۳) نتھورام ۱۸۶۲ء–۱۹۲۲ء،

(۲۴) تری بھون داس ۱۸۶۳ء،

(۲۵) امرت لال، پڈھی یار، ۱۸۶۰ء،

(۲۶) بھوگیندر راؤ ۱۸۶۵ء–۱۹۱۵ء،

(۲۷) رنجیت راؤ ۔۔۔،

(۲۸) ڈایابھائی، ناٹک لکھنے میں وقت صرف کیا، ۱۹۰۶ء،

(۲۹) نتھالال کوی ابن دلپت رام کوی، اس وقت ان کی عمر تقریباً ۵۰ سال کی ہوگی "گربا" لکھنے میں آپ کو کمال ہے، یہ ایم اے ہیں، اور فارسی بھی آشنا ہیں، انکے علاوہ اس عہد میں نرسی راؤ، بلونت راؤ، کلاپی، منی شنکر متوفی ۱۹۲۲ء اور بوٹاڈکر وغیرہ قابل ذکر ہیں،

سب سے آخر میں مجھے افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ مسلمان گجراتی شعراء کے نام اور حالات دستیاب نہیں ہوئے، حالانکہ اکثر احباب سے میں نے طلب کی، مگر نہ مل سکے، اگر کوئی صاحب اطلاع دیں گے، تو بے حد شکرگذار ہوں گا،

پدماوت کا مُصنّف کون تھا؟

از

مولانا سعید انصاری صاحب رفیق دار المصنفین

منشی برج بھوکن لال صاحب محب نے دریاباد (ضلع بارہ بنکی) کی ایک تاریخ لکھی ہے جو ۱۹۲۵ء میں لکھنؤ کے ای پریس سے چھپ کر شائع ہوئی ہے، اسمیں قاسم شاہ صاحب کی ایک منظوم بھاشا تصنیف "ہنس جواہر" کا تذکرہ کرتے ہوئے پدماوت سے اوس کا مقابلہ کرکے ترجیحی پہلو پیدا کیا گیا ہے، اس سلسلہ مین پدماوت کی نسبت "خلاصۃ التواریخ" کی حسب ذیل عبارت نقل کی گئی ہے:۔

نسخہ پدماوت مشتمل بر حقیقت رائے رتن سین مرزبان چیتور کہ بنا بر پدماوت زوجہ خود با سلطان علاء الدین والی دہلی محاربہ نمودہ بود کہ مصر پدمادھر نام ساکن راجہا بخط ہندی نوشتہ آن را باہو رام خلاصہ مریدان گوسائین ولی رام بعبارت مرغوب بفارسی در آوردہ۔

(تاریخ دریاباد ص ۱۰۹)

اور اس سے حسب ذیل تاریخی نتائج نکالے گئے ہین:۔

(۱) پدماوت کو اول مصر پدمادھر نے جو رائے رتن سین کے درباری رکن تھے، بزمانہ علاء الدین (۶۹۵ھ/۱۲۹۶ء تا ۷۱۶ھ/۱۳۱۶ء) والی دہلی بھاشا زبان مین تصنیف کیا،

۲۔ بعد اوس کے باہو رام مرید گوسائین ولی رام کے ذریعہ اسے فارسی جامہ نصیب ہوا،

۳۔ اور ہندی تصنیف کی مدت ایک مدت کے بعد شیر شاہ (۹۴۷ھ/۱۵۴۰ء تا ۹۵۲ھ/۱۵۴۵ء) کے عہد مین ملک محمد جائسی

کی کتاب پدماوت تالیف ہوئی،

۴۔ اورنگ زیب (۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء تا ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء) کے زمانہ تک نقاشِ اول کی دھوم رہی (یعنی پدمادھر پدماوت کے مصنف کی حیثیت سے مشہور رہا، کیونکہ خلاصۃ التواریخ اورنگ زیب کی عہد کی تصنیف ہے،) پھر نقش ثانی کا رواج ہوا، (یعنی ملک محمد جائسی کی پدماوت کا شہرہ ہوا، اور پدمادھر کی شہرت فنا ہو گئی،) جو اس وقت تک شہرت کے ساتھ قائم ہے،

۵۔ اس واقعہ سے ہنس جواہر (مصنفہ قاسم شاہ صاحب) کا درجہ ملک محمد جائسی کی کتاب پدماوت کے مقابلہ مین ممتاز نظر آتا ہے، کیونکہ یہ پدماوت مصر پدمادھر اور باہو رام کی کتابون کا ترجمہ ہے، اور ہنس جواہر قاسم شاہ کی طبع زاد تصنیف ہے،

لیکن ان نتائج مین متعدد غلط فہمیان ہین،

۱۔ مصر پدمادھر (صحیح پدمادھر) مصنف پدماوت کو رائے رتن سین والی چیتور کا درباری فرض کیا گیا ہے، جس کے لئے تاریخی سند کی ضرورت ہے، اور مصنف نے خلاصۃ التواریخ کی مذکورہ بالا عبارت کے علاوہ (جو قابل بحث ہے) کوئی سند مہیا کرنے کی زحمت گوارا نہین فرمائی ہے،

۲۔ چونکہ پدمادھر کا زمانہ قطعیت کے ساتھ معلوم نہین ہے، اسلئے پدماوت کا زمانہ تصنیف سلطان علاء الدین والی دہلی کا عہدِ سلطنت (۶۹۵ھ/۱۲۹۶ء تا ۷۱۶ھ/۱۳۱۶ء) بمشکل فرض کیا جا سکتا ہے،

۳۔ پدمادھر کی پدماوت کے کسی نسخہ کا کسی کتب خانہ مین مصنف نے وجود نہین ثابت کیا ہے، اسلئے اوس کے فارسی ترجمہ (مصنفہ باہو رام) کے وجود کا یقین بھی آسانی کے ساتھ نہین آسکتا

۴۔ پدمادھر کی پدماوت اور اس کا فارسی ترجمہ چونکہ "مشکوک الوجود" اور "مفقود الخبر" ہین، اسلئے ایسی کتابونکو قطعیت کے ساتھ ملک محمد جائسی کی پدماوت کا ماخذ قرار نہین دیا جا سکتا،

۵۔ یہ بھی تسلیم کرنا مشکل ہے، کہ خلاصۃ التواریخ کے زمانہ تصنیف تک جو اورنگ زیب کے عہد مین لکھی گئی، پدماوت کا مُصنّف پدمادھر ہی تسلیم کیا جاتا تھا، اور ملک محمد جائسی کی پدماوت گوشہ گمنامی مین پڑی ہوئی تھی

۴۔ بدہادھر اور نباہورام کی کتابون کا وجود ثابت ہونے سے پہلے یہ کیونکر مانا جا سکتا ہے، کہ ملک محمد جائسی کی پدماوت اون کا ترجمہ تھی، اور اس لئے "ہنس جواہر" (مصنفہ قاسم شاہ) اوس پر ترجیح رکھتی ہی،

حقیقت یہ ہی کہ مصنف کے پیش نظر خلاصۃ التواریخ کا جو مطبوعہ نسخہ تھا، اس مین عبارت غلط چھپی ہی، دارالمصنفین مین اوس کا قلمی نسخہ موجود ہے، اس کتاب کا مصنف سجان سنگھ دہیر ساکن قصبہ بٹیالہ اپنی ماخذون کو گناتے ہوے پدماوت کے متعلق لکھتا ہی:۔

"ونسخہ پدماوت مشتمل بر حقیقت رائے رتن سین، مرزبان چتور، کہ بنا بر پدماوت زوجہ خود با سلطان علاء الدین والی دہلی محاربہ نمودہ"

یہ عبارت یہین پر ختم ہوگئی ہے، اور اس سے حسب ذیل نتائج پیدا ہوتے ہین،

۱۔ پدماوت مین رائے رتن سین والی چتور کا قصہ لکھا ہے، جو اپنی بیوی پدماوت کی وجہ سے سلطان علاء الدین والی دہلی سے لڑا تھا،

۲۔ اس مین یہ تصریح نہین ہی، کہ پدماوت علاء الدین کے زمانہ مین تصنیف ہوئی تھی،

۳۔ نہ اس کا ذکر ہے کہ پدماوت کا مصنف کون تھا، ؟ اور کس زمانہ مین گذرا تھا، ؟

۴۔ نہ اس کا پتہ ہے، کہ پدماوت کا بھاشا سے فارسی مین ترجمہ ہوا تھا،

لہ کتبخانہ برٹش میوزیم اور بانکی پور کی فہرستون مین اس نام کے مختلف تلفظ لکھے ہین، مارلے، اور راسپر نگر نے (اس ن ج ان)، نیس اور ولیٹ نے (ش ب ج ان) گارسن دی تاسی نے (ش ج ان) پڑھا ہے، بوڈلین لائبریری کی فہرست مین ایتھے نے (ش ج ان را ے) لکھا ہے، جو تاسی کے مطابق ہے، چونکہ آخری تلفظ مین "بند دین" ہے اس لئے وہی صحیح ہے، بانکی پور کی فہرست مین مصنف کو کھتری لکھا گیا ہے، اور اس کی تائید دارالمصنفین کے قلمی نسخہ سے ہوتی ہے، کہ اس مین نام کا جزء سنگھ کا لفظ بھی جو پنجاب کے اون کھتریون کے نام کے ساتھ شامل ہوتا ہے، جو سکھ مذہب کے پیرو ہوتے ہین،

اب آگے چلئے، پدماوت کے ذکر کے بعد سجان سنگھ نے اپنی کتاب خلاصۃ التواریخ کے دوسرے ماخذ کا تذکرہ کیا ہے اور وہ یہ ہے:۔

"ونسخہ راجاولی کہ مصرح بہ بدہادھر[1] اسامی راجہا بخط ہندی نوشتہ، و آنرا نباہورام[1] خلاصہ مریدان گسائین ولی بعبارات مرغوبہ بفارسی در آوردہ"

اس سے ثابت ہوتا ہے، کہ:۔

۱۔ راجاولی ہندی زبان مین ایک کتاب مصرح بہ بدہادھر نے تصنیف کی تھی،

۲۔ نباہورام نے اسی راجہ ولی کو فارسی زبان مین لکھا تھا،

۳۔ راجاولی مین راجاؤن کے نام لکھے گئے تھے،

۴۔ بدہادھر اور نباہورام کب اور کس زمانہ مین گذرے ہین، ؟ اس کا کچھ ذکر نہین ہے،

دارالمصنفین کے قلمی نسخہ سے ہم نے جو عبارتین نقل کی ہین، برٹش میوزیم اور بانکی پور کے نسخون مین بھی اسی کے مطابق ہین،

اب حسب ذیل مسائل پر غور کرو،

۱۔ پدماوت اور راجاولی دو کتابین ہین،

۲۔ پدماوت مین رائے رتن سین کی رانی پدماوت کا قصہ ہی، اور راجاولی مین راجاؤن کے نام ہین، اسلئے دونون کے موضوع مین بڑا فرق ہی، جو دونون کے نامون سے ظاہر ہے،

۳۔ پدماوت کے مصنف کا نام نہین لکھا ہے، اور راجاولی کے مصنف کا نام بدہادھر اور فارسی مترجم کا نام نباہورام بتایا گیا ہے، پھر بدہادھر پدماوت کا مصنف کیسے ہو سکتا ہے، اور نباہورام کے پدماوت کے فارسی

لہ و لہ قلمی نسخہ مین یہ نام صاف نہین پڑھے گئے، کتبخانہ برٹش میوزیم اور بانکی پور کی فہرستون مین پہلا نام (ب دّ ھ ا د ھ ر) Bidhadkor اور دوسرا (ن ب ا ہ و رام) Nibahuram لکھا ہی، اس لئے مصنف نے تاریخ دریاباد مین بدہادھر اور باہورام جو نام لکھے ہین، غلط ہین،

ترجمہ کو کس طرح پیدا کیا جا سکتا ہے؟

۴۔ پدماوت، ملک محمد جائسی کی تصنیف ہے، اور یہ ایک ایسی حقیقت ہو، جس کا انکار اب تک کسی نے نہین کیا ہے، خلاصۃ التواریخ مین جو پدماوت کے مصنف کا نام نہین لیا گیا ہے، اوس کا سبب یہ نہ تھا، کہ پدماوت کسی اور شخص نے بھی لکھی تھی، بلکہ یہ سبب تھا، کہ پدماوت کا ملک محمد جائسی کی تصنیف ہونا ایک مشہور بات تھی،

۵۔ خلاصۃ التواریخ کے ماخذون کی فہرست مین متعدد نام ایسے بھی ملتے ہین، جن کے مصنفین کا ذکر نہین کیا گیا ہے، مثلاً گل افشان جو سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ تھا، اور جس مین بکرماجیت کے حالات تھے، تاریخ شہاب الدین غوری، تاریخ سلطان علاء الدین خلجی، تاریخ بہادر شاہی جس مین گجرات (احمد آباد) کے بادشاہون کے حالات تھے، تاریخ سلاطین جس مین ملتان، مالوہ، دولت آباد (دکن) جونپور، بنگالہ، اُوڑیسہ کے سلاطین کا تذکرہ تھا، تو کیا ان سب کتابون کو بھی فرضی مصنفین کی طرف منسوب کر دیا جائے گا؟

لہ فہرست کتبخانۂ برٹش میوزیم بانکی پور،

تلخیص و تبصرہ

طریقِ معاش کا انتخاب

طریق معاش کا انتخاب اپنی اہمیت کے لحاظ سے جسقدر غور و تامل کا مستحق ہو، اسی قدر اُس مین غفلت و بے پروائی برتی جاتی ہے، ہر پیشہ کے لئے اختیار کرنے والے کی صلاحیت اور استعداد کا لحاظ کرنا ضروری ہے، اور اسی اعتبار سے اوسکی تعلیم و تربیت ہونی چاہیے، لیکن عام طور پر طلبہ کی صلاحیت و استعداد پر کوئی توجہ نہین کی جاتی اور بغیر اس خیال کے کہ جس پیشہ کیلئے اونھین تیار کیا جا رہا ہے، اُس مین وہ کہان تک کامیاب ہو سکتے ہین، والدین اُنھین اپنی پسند یا مصلحت کے لحاظ سے تعلیم دیتے رہتے ہین، بہت کم والدین کا انتخاب طلبہ کی استعداد کے موافق ہوتا ہو، عموماً اون کے اندازہ اور قیاس مین غلطی ہو جاتی ہو، جس کی پاداش طلبہ کو تمام عمر اپنی ناکام زندگی مین برداشت کرنی پڑتی ہے، اس غلطی سے بچنے کی غرض سے چند سالون سے یورپ کے بعض ملکون مین ایسے ادارے قائم کئے گئے ہین، جنمین ابتدا ہی سے طلبہ کی صلاحیت اور استعداد کی جانچ ہوتی رہتی ہے، اور زمانۂ تعلیم ہی مین اون کو بتا دیا جاتا ہو کہ وہ کن پیشون کیلئے زیادہ موزون ہین تاکہ اوسی لحاظ سے وہ اپنے آیندہ طریق معاش کا انتخاب کر کے اس کے لئے تیاری کرین اور زندگی مین کامیاب ہو سکین، انگلستان مین بھی اس قسم کا ایک ادارہ (Institute of Industrial Psychology) دس سال سے کام کر رہا ہو، اس کے صدر ڈاکٹر مارس (Dr. C. S. Myers) نے اس موضوع پر حال مین ایک مقالہ مانچسٹر گارجین مین تحریر کیا تھا جسے اسٹیٹسمین نے نقل کیا ہو، اس کی تلخیص ہم سطور ذیل مین پیش کرتے ہین،:۔

اگر کسی شخص نے کوئی ایسا پیشہ اختیار کر لیا ہے، جس کے لئے وہ موزون نہین ہو، تو انفرادی حیثیت سے اس کی زندگی

ناکام اور دردناک ہے، اور اجتماعی حیثیت سے وہ ایک ایسے مسئلہ کو پیش کر رہا ہے، جو موجودہ زمانہ کے اہم مسائل میں سے ہے، غلط پیشہ اختیار کرنے کا نتیجہ غیر آسودگی، بے اطمینانی، ناشادگی، وناکامی، خود اعتمادی کا نقصان، اور انسانی قوتوں کا حیرت انگیز اتلاف ہے، لیکن دانشمندی کے ساتھ صحیح پیشہ کا انتخاب کرنا بھی آسان نہیں ہے، اُس کے لئے لڑکے یا لڑکی کی دماغی جسمانی اور مزاجی قابلیت اور استعداد کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانا ضروری ہے اس کیلئے یہ معلوم کرنا بھی ضروری ہے، کہ مختلف پیشوں کے لئے کس کس قسم کی اہلیت اور قابلیت درکار ہے، پیشوں کے انتخاب میں اکثر و بیشتر اتفاق ہی کو دخل ہوتا ہے، محض اس لئے کہ بچوں اور اُن کے والدین واساتذہ کو وہ معلومات حاصل نہیں ہوتے جو ایک صحیح تر انتخاب کیلئے ضروری ہیں، فلسفۂ نفسیات میں جو ترقی حال میں رونما ہوئی ہے، اوس نے خوش قسمتی سے اس مسئلہ کا حل بھی پیدا کر دیا ہے، ماہرین نفسیات سالوں سے ایسے طریقے معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، جن سے طلبہ کی ذہنی اہلیت اور مزاجی اور کرداری کیفیت کا صحیح اندازہ ہو سکے، اور وہ ایک بڑی حد تک اس کوشش میں کامیاب ہو گئے ہیں، وہ اپنے طریقہ پر زید کی جانچ کر کے صرف یہی نہیں بتا دیتے کہ وہ ایک ذہین لڑکا ہے، بلکہ یہ بھی بتا دیتے ہیں، کہ یونیورسٹی کے جن طلبہ نے نمایان کامیابی کے ساتھ اعلیٰ ڈگریان حاصل کی ہیں، زید اپنی ذہنی استعداد کے لحاظ سے ان سے کسی قدر بڑھا ہوا ہے، نیز اونھین یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اوس میں صنعت وحرفت کے پیشوں میں کامیاب ہونیکی صلاحیت بہت کم ہے، اور انجنیری، تعمیرات، دوکان سازی، اور اسی قسم کے دوسرے پیشے اوس کے لئے موزون نہیں ہیں، نفسیاتی جانچ کے ذریعہ سے وہ معلوم کر لیتے ہیں کہ زید میں خود اعتمادی، حاضر جوابی، احتیاط اور منطقی استدلال کی صفتیں موجود ہیں، اور اس سے زبانی گفتگو کر کے وہ اس خیال کی تصدیق کر لیتے ہیں، کہ وہ ایک کامیاب بیرسٹر ہو سکتا ہے، دریافت کرنے پر زید کبھی اس پیشہ کے متعلق اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتا ہے، پھر اس کے اساتذہ بیان کرتے ہیں کہ لاطینی اور انگریزی زبانوں میں اسکی استعداد بہت اچھی ہے، اور انجمن مباحثہ کا وہ ایک سرگرم رکن ہے، آخر میں اوس کے باپ سے گفتگو کر کے یہ معلوم کر لیا جاتا ہے، کہ وہ زید کو بیرسٹری کی تعلیم دلانے کی استطاعت رکھتا ہے، اور تعلیم سے فراغت کے بعد ہی جب تک زید کی آمدنی قابل اطمینان نہ ہو جائے، اوس کی مالی امداد کرنے کیلئے آمادہ ہے، ان معلومات کے بعد زید کے لئے یہ پیشہ منتخب کیا جاتا ہے،

انگلستان میں اس قسم کی جانچ اور مشورہ کا کام ایک خاص ادارہ نفسیات (National Institute of Industrial Psychology) کے ہاتھ میں ہے، دس سال سے زائد سے اس ادارہ کے ارکان مختلف پیشوں کے لئے طلبہ کی صلاحیت اور استعداد کی جانچ کے طریقے وضع کر رہے ہیں، اور اونھوں نے تفصیل کے ساتھ اُن ضروریات کا مطالعہ کیا ہے، جس کا لحاظ ہر پیشہ کے انتخاب کیلئے لازمی ہے، اونھوں نے تین عنوانوں کے ماتحت تمام پیشوں کی تقسیم کی ہے (۱) وہ پیشے جن کا تعلق خاص طور پر شخص سے ہے مثلاً درس وتدریس، عملہ کی نگرانی وغیرہ، (۲) وہ پیشے جو خاص کر اشیاء سے متعلق ہیں، مثلاً فن تعمیر چمن بندی وغیرہ (۳) وہ پیشے جو خصوصیت کے ساتھ مجرد خیالات اور علامات سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً روپیہ وغیرہ کا حساب کتاب یہ تقسیم اگرچہ ناقص ہے تاہم کارآمد ہے،

یہ ادارہ جن طلبہ کو کسی پیشہ کے انتخاب کی بابت مشورے دیتا ہے، اُن سے دریافت بھی کرتا رہتا ہے کہ وہ اپنے انتخاب میں کہاں تک کامیاب ہوئے، اس دریافت کے جو جوابات موصول ہوئے ہیں، وہ بہت امید افزا ہیں، اور اون سے معلوم ہوتا ہے، کہ جو مشورے ادارہ نے دیے تھے، وہ عمومیت کے ساتھ صحیح اور کامیاب ثابت ہوئے چنانچہ جن لوگوں نے ادارہ کے مشوروں پر عمل نہیں کیا، ان میں کامیابی اور ناکامی کا تناسب تقریباً برابر ہی رہا، لیکن جن لوگوں نے اس کے مشوروں پر عمل کیا، ان کی کامیابی ناکامی سے نوگنا زیادہ تھی،

یہ ادارہ جس کی شاخیں انگلستان کے متعدد مدارس میں قائم ہو گئی ہیں، اونچے درجوں کے طلبہ میں سے ہر سال تقریباً آٹھ سو طلبہ کو اُن کے آیندہ طریق معاش کے انتخاب کے متعلق مفید اور مناسب مشورے دیتا رہتا ہے، لیکن یہ قلیل تعداد اوس کثیر تعداد کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہے، جو اس قسم کے مشوروں سے محروم رہنے کے باعث زندگی میں عموماً ناکام رہتی ہے، لہذا خیال یہ ہے کہ رفتہ رفتہ تمام مدارس میں ایسے اساتذہ مقرر کر دیے جائیں جن کا کام خاص طور پر وقتاً فوقتاً طلبہ اور طالبات کی صلاحیت اور استعداد کی جانچ کرنا، اور اونھیں مفید مشورے دینا ہوگا، یہ اساتذہ ادارۂ نفسیات کے تعلیم یافتہ ہوں گے، اور اوسی ادارہ کے طریقوں پر عمل کریں گے،

"ع ز"

یورپ میں اوسط پیدایش کے انحطاط کا اقتصادی اثر

پروفیسر ہرمش (Harmsen) ہمبرگ یونیورسٹی نے ان اثرات کا مطالعہ کرنے کے بعد جو یورپ میں اوسط پیدایش کے انحطاط سے اقتصادی حالات پر پڑ رہے ہیں، جیسا کہ اسٹیٹسمین راوی ہے، یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ انحطاط مستقل کساد بازاری کے پیدا کرنے کا ایک قوی باعث ہوگا، اور اس سے بے روزگاری کا مسئلہ حل نہ ہو سکے گا، پروفیسر موصوف بتاتے ہیں کہ سیکڑوں برس تک یورپ کے ملکوں کا سالانہ اوسط پیدایش تقریباً (۴۰) فی ہزار تھا، انحطاط فرانس میں شروع ہوا، اور گذشتہ صدی کے دوران میں اس کی رفتار برابر جاری رہی، اس صدی کے آخری ربع میں یہ انحطاط ان ملکوں میں بھی شروع ہو گیا، جہاں جرمن نسل کے لوگ آباد ہیں، اور وہاں موجودہ صدی کی ابتدا میں اس انحطاط میں تیزی کے ساتھ ترقی ہوتی گئی، جنگ عظیم کے قریب اٹلی اور مغربی سلافی قوموں (Western Slavs) میں کچھ انحطاط رونما ہونے لگا، فرانس میں اگرچہ اوسط پیدایش برابر گرتا جا رہا تھا، تاہم ۱۹۳۱ء کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ اوس سال دوسرے ممالک کا اوسط فرانس سے بھی کم تھا، فرانس کا اوسط پیدایش فی ہزار (۱۷ء۴) تھا، جرمنی کا (۱۶) سوئزرلینڈ اور ناروے کا، (۱۶ء۱) انگلستان کا (۱۵ء۸) اور سویڈن کا (۱۴ء۸) جنگ کے بعد ہی اسپین، پرتگال، پولینڈ، سوویٹ روس، اور ریاستہائے بلقان میں بھی اوسط پیدایش گرنے لگا، اونچے طبقوں کی بہ نسبت صنعت و حرفت کے طبقوں میں اوسط پیدایش زیادہ ہے، لیکن شہروں میں اس کا انحطاط دوسروں سے زیادہ غربا میں نمایاں ہے،

اوسط پیدایش کے انحطاط کا اثر ملک کی آبادی پر یہ پڑا کہ تمام یورپ اور خصوصاً اس کے شمالی اور مغربی ممالک میں بچوں کی تعداد کا تناسب بہت گھٹ گیا، اور بڑوں کا تناسب اس وقت بڑھا ہوا ہے جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اوسط اموات میں کمی ہو گئی ہے لیکن نوجوانوں کی تعداد کے تناسب میں کمی شروع ہو گئی ہے، اور بوڑھوں کا تناسب زیادہ ہو گیا ہے، یعنی جیسا کہ پروفیسر موصوف لکھتے ہیں: اگر اس وقت بچوں کی تعداد کم ہے، اور بڑوں اور بوڑھوں کی زیادہ تو تھوڑے ہی دنوں میں بچوں اور کام کرنے کے قابل اشخاص کی تعداد اور بھی کم ہو جائے گی اور

بوڑھوں کی تعداد میں اضافہ ہو جائے گا، شمالی اور وسط مغربی یورپ میں اوسط پیدایش اوسط اموات کے تقریباً برابر ہی ہے، اور ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں یہ اوسط اموات سے نیچے گر جائے، یعنی مغربی یورپ کی آبادیوں میں جمود کے آثار پائے جاتے ہیں،

اس صورت حال کے اقتصادی اثرات کیا ہوں گے؟ پروفیسر ہرمش اس سوال کا جواب یہ دیتے ہیں کہ پیدا کرنے والوں کی بہ نسبت صرف کرنے والوں کی تعداد کم ہو جائے گی، کیونکہ معاشی نقطۂ نظر سے پیدا کرنے والوں کی تعداد تقریباً تمامتر جوانوں اور پختہ عمر والوں پر مشتمل ہے، بچوں کا کام پیدا کرنا نہیں، بلکہ صرف کرنا ہے، اور ان کی تعداد کا انحطاط بوڑھوں کی تعداد کی افزایش سے زیادہ ہے، پیدا کرنے والوں کی تعداد کی مناسبت سے صرف کرنے والوں کی تعداد کا یہ مستقل انحطاط لازمی طور پر بے روزگاری کو ترقی دیتا رہے گا، اور یہ بے روزگاری کوئی وقتی اور موسمی بے روزگاری نہ ہوگی، بلکہ ایسی بے روزگاری ہوگی، جسے بجا طور پر ترکیبی کہہ سکتے ہیں، کیونکہ یہ نتیجہ ہوگی آبادی کی ترکیب عمری کا"

اس بے روزگاری کو دور کرنے کیلئے پروفیسر موصوف یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ کام کے گھنٹوں میں تدریج تخفیف کر دی جائے، جن کاموں کیلئے اجرت مقرر ہے، ان کے لئے عمر تدریج محدود کر دی جائے، طبقۂ عوام کی قوت خریداری میں اضافہ ہو جائے، اور تنخواہوں میں تخفیف کر کے ملازمتوں کی تعداد بڑھائی جائے، لیکن اوسط پیدایش کے گر جانے سے جو ترقی پذیر کساد باری وجود میں آگئی ہے، اوس کو رفع کرنے کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ یہ ہے کہ معاشی زندگی کے مختلف شعبوں میں آبادی اور سرمایہ کی تقسیم میں ایک تبدیلی پیدا کر دی جائے، تمام ضرورتیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے یکساں نہیں ہوتیں، ایک شخص کو اپنی بھوک اور پیاس بجھانے کیلئے غذا اور پانی کی ایک متعین مقدار چاہئے، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ کسی صاحب علم کی تشفی کیلئے کتنی کتابوں کی ضرورت ہوگی، یا تصویروں کی کونسی تعداد اس شخص کے ذوق کو پورا کر دے گی، جو انھیں جمع کرنے کا شائق ہے، غرض جو ضروریات خالص مادی اور زندگی کیلئے لازمی ہیں، وہ سامان کی ایک محدود مقدار سے پوری ہو سکتی ہیں، لیکن جو ضروریات اجتماعی، دماغی، فنی، اخلاقی، یا اسی قسم کی ہیں وہ حقیقۃً غیر محدود ہیں، اور ان کو پورا کرنے کا نتیجہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ ایک مزید ضرورت پیدا ہو جاتی ہے، پہلی قسم کی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے کوئی آبادی سامان کی جو مقدار استعمال کر سکتی ہے، اس کی تعیین خاص طور پر اس آبادی کی

مجموعی تعداد سے کی جاتی ہے، اور دوسری قسم کی ضروریات کیلئے سامان کی جو مقدار درکار ہوتی ہے اس کا انحصار خصوصیت کے ساتھ اوس آبادی کے معیار حیات و تمدن اور اوس کی قوت خریداری پر ہوتا ہے، پروفیسر برش کا خیال ہے کہ پہلی قسم کے سامانوں کا اوسط پیداوار کم کر دینا چاہئے، دوسری قسم کے سامانوں کی طلب تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ بڑھتی ہی جائے گی، خواہ آبادی اپنی جگہ پر بدستور قائم رہے،

"ع ز"

سرطان کے علاج میں ترقی

تین ہزار برس سے زیادہ ہوئے، جب کہ مصر کے قدیم پجاریوں نے سرطان کے بعض مریضوں کو دیکھ کر اس مرض کے متعلق کچھ لکھا تھا اور اس کے علاج کے لئے ایک مرہم تجویز کیا تھا، جو دراصل بہت کم مفید ثابت ہوا، پھر اس کے بعد سے تقریباً ایک سو برس پہلے تک اس مرض کی نسبت بہت کم معلوم ہو سکا، ایک سو سال ہوئے، ماہرین حیوانات و نباتات اور اطبا نے خوردبین کے ذریعہ اس کا معائنہ شروع کیا اور تیس سال کے عرصہ میں یہ معلوم کر لیا کہ سرطان کی متعدد قسمیں ہیں، جو ایک دوسرے سے بہت کچھ مختلف ہیں، جو سرطان جلد سے پیدا ہوتے ہیں، وہ جلد کے چھوٹے چھوٹے خانوں سے بنتے ہیں، اور جو اندرونی اعضاء سے نکلتے ہیں، وہ اُن خانوں سے بنتے ہیں جن سے ان اعضا، کی تعمیر ہوتی ہے، ہڈی کا سرطان جسم کے کسی اور حصہ کے سرطان سے مختلف ہوتا ہے، تبدریج ان سرطانوں کی علحدہ علحدہ تقسیم قائم کی گئی، ان کے جدا جدا نام رکھے گئے اور یہ قلم بند کر لیا گیا کہ بعض سرطان دوسرے دوسروں کی بہ نسبت بہت زیادہ خطرناک ہوتے ہیں، تقریباً اسی زمانہ میں فن جراحی میں بھی ترقی رونما ہونے لگی اور بعض سرطانوں پر عمل جراحی کیا بھی گیا، لیکن انیسوین صدی کے وسط تک جبتک کہ بے حس کرنے والی دواؤں کا استعمال عام نہیں ہو گیا، سرطان کے بڑے آپریشن نہیں کئے گئے، اور چونکہ تمام زخم پک جاتے تھے، اس لئے بہت کم غدود کاٹ کر نکالے جاتے تھے، پھر لسٹر (Lister) کی عظیم الشان تحقیق سے یہ بات معلوم ہوئی کہ صفائی اور دافع تعدیہ اشیاء کے استعمال سے زخم کو پکنے اور خراب ہونے سے روکا جا سکتا ہے، اور اس انکشاف کے بعد سرطان کے نازک آپریشن بھی کئے جانے لگے، لیکن تندرست ہو جانے والے اشخاص کی تعداد پھر بھی کم ہی رہی،

۱۸۹۶ء میں رونتجن (Roentgen) نے عکس ریز (اکس ریز) کو دریافت کیا اور ۱۸۹۸ء میں میڈم کیوری (Madam Curie) نے ریڈیم کو معلوم کیا، ان دریافتوں کے بعد سے سرطان کے علاج کا جدید طریقہ شروع ہوا، یعنی آپریشن کے ذریعہ سے نکال دینا یا ریڈیم کے ذریعہ سے فنا کر دینا، لیکن بہت سے سرطان ایسے ہیں، جو آپریشن یا ریڈیم کسی طریقے سے اچھے نہیں ہو سکتے،

۱۹۱۰ء کے قریب یہ معلوم کیا گیا، کہ سفید چوہوں کو بھی انسان ہی جیسا سرطان ہوتا ہے، اور یہ ایک جانور کے جسم سے نکال کر دوسرے جانور کے جسم میں منتقل کیا جا سکتا ہے،

یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سرطان کسی جرثومہ (germ) کے سبب سے نہیں ہوتا، لہذا یہ قدیم خیال بالکل غلط تھا، کہ سرطان کے مریض کا تعدیہ اس کے تیمارداروں پر بھی اثر انداز ہو سکتا ہے، اسی طرح جانوروں پر تجربہ کر کے یہ بھی دکھایا جا چکا ہے، کہ یہ مرض موروثی نہیں ہوتا،

جانوروں میں سرطان بعض معمولی کیمیاوی مواد (Chemicals) سے پیدا کیا جا سکتا ہے بعض کیڑے بھی سرطان پیدا کرنے کا سبب ہو سکتے ہیں، مصر میں ایک قسم کا کیڑا ہوتا ہے، جس کے کاٹنے سے سوزش پیدا ہوتی ہے اور اُسی قسم کا سرطان پیدا ہو جاتا ہے، جیسا فراعنہ مصر کے زمانہ میں وہاں کے باشندوں میں پایا جاتا تھا، کیڑوں کے کاٹنے سے جو سرطان پیدا ہوتا ہے، وہ بہ نسبت سرد ملکوں کے مشرق بعید میں بہت زیادہ پایا جاتا ہے،

اس میں شبہہ نہیں کہ لوگ اگر حفظان صحت کے معمولی اصولوں پر عمل کرنے لگیں، تو بہت سے سرطانوں سے نجات مل سکتی ہے، مثلاً منہ کے سرطان اکثر ایسے مصنوعی دانتوں کے استعمال سے جو ٹھیک لگتے نہیں یا تیز دانتوں کے زبان پر رگڑنے سے یا اسی قسم کے دوسرے اسباب سے جنھیں دفع کیا جا سکتا ہے، پیدا ہو جاتے ہیں، اسی طرح جو سرطان مارکول یا ایسے روغنوں سے پیدا ہوتے ہیں، جو مشینوں میں استعمال کئے جاتے ہیں اُن سے بچنے کا بہت آسان طریقہ یہ ہے کہ کثرت سے غسل کیا جائے، تاکہ اس قسم کے روغن جسم سے صاف ہوتے رہیں،

"ع ز"

یونان کے بعض آثار قدیمہ

گذشتہ موسم گرما میں یونان کے دار السلطنت ایتھنز میں ماہرین آثار قدیمہ نے بہت سی نادر چیزیں کھود کر نکالی ہیں، ایتھنز کے قدیم بازار (The agora) میں بے شمار کنوے تھے، ان میں سے صرف ایک کنوے سے (۲۱۷) چیزیں برآمد کی گئی ہیں، یہ چیزیں چھٹی صدی قبل مسیح سے لیکر [illegible] قبل مسیح تک کی ہیں، ان میں سب سے زیادہ قدیم چیز ایک خوبصورت برتن ہے، جس میں دو دستے لگے ہوئے ہیں، یہ ساتویں صدی قبل مسیح کے آخری دور کا ہے، اس کے علاوہ ایک اور نہایت قدیم گلدان ہے، جس کی شکل ایک جھکے ہوئے لڑکے کے مانند ہے، جس مقام پر یہ قدیم بازار واقع تھا، وہاں اب جدید عمارتیں بن گئی ہیں، اور ان آثار قدیمہ کے نکالنے کیلئے بہت سے جدید مکانات کو گرا دینا پڑا ہے، گذشتہ موسم گرما کی کھدوائی میں کنوؤں کے علاوہ بالکل غیر متوقع طور پر ایک مقبرہ بھی برآمد ہوا ہے، اس میں تین انسانی ڈھانچے، ایک نیلے شیشے کا ہار اور چند ٹوٹے ہوئے گلدان ملے ہیں، اسی کے قریب فتح کے پر دار دیوتا کے دو مجسمے بھی برآمد ہوئے ہیں، جو پانچویں صدی قبل مسیح کے بنے ہوئے ہیں، ایک سنگ مرمر کا مجسمہ شہنشاہ ہیڈرین (دوسری صدی عیسوی) کا بھی نکلا ہے، اس کا سر ابتک نہیں ملسکا ہے، لیکن اور علامات سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے، کہ یہ مجسمہ اسی شہنشاہ کا ہے، ایک اور سنگ مرمر کا مجسمہ چوتھی صدی قبل مسیح کا شاہکار ہے، یہ ایک نوجوان حسینہ کا مجسمہ ہے، جس کا لباس اس قدر باریک دکھایا گیا ہے کہ جسم کی خوبصورتی لباس کے اوپر سے بھی نمایاں ہے، قریب تین سو قندیلیں (لیمپ) برآمد ہوئی ہیں، جو مختلف قسموں اور ساتویں صدی قبل مسیح سے چوتھی صدی عیسوی تک کے مختلف زمانوں کی بنی ہوئی ہیں، تین سال کی کھدوائی میں ایک ہزار سے زیادہ کتبے، اور چوبیس ہزار سے زیادہ قدیم سکّے ملے ہیں، اس سلسلہ میں ایک دلچسپ چیز یہ ہاتھ آئی ہے، کہ یونان کے قدیم معمار پختہ عمارتوں میں جو مسالہ دیتے تھے اس کا نسخہ مل گیا، ڈاکٹر لیسلی شیر (Dr. Leslie Shear) جنکی سرکردگی میں امریکہ کے ماہرین آثار قدیمہ نے ان میں سے

اکثر چیزیں برآمد کی ہیں، اپنے ساتھ پرانی گچ کے کچھ ٹکڑے امریکہ لیتے آئے تھے، جن کا تجزیہ کرنے پر معلوم ہوا کہ ان میں (۲) فی صدی بالو اور (۲۶) فی صدی چونا ہے، لیکن کہا جاتا ہے کہ یہ تناسب اوس نسخہ سے مختلف ہے جو شہنشاہ اغسطس (پہلی صدی قبل مسیح) کے زمانہ کا معمار وٹروویس (Vitruvius) چھوڑ گیا ہے،

قدیم اہل ایتھنز کی مذہبی زندگی سے متعلق بھی کچھ معلومات حاصل ہوئے ہیں، یونان میں فرقہ ادریہ (Gnostic) دوسری صدی عیسوی کا ایک طاقتور فرقہ تھا، جس کے مذہب میں سحر کاری کے علاوہ یونانی، مصری، اور شامی مذاہب کے اجزا بھی شامل تھے، ان لوگوں کے پاس بعض ایسے جواہرات ہوتے تھے، جن پر عجیب و غریب قسم کی تصویریں بنی ہوتی تھیں اور عجیب و غریب دیوتاؤں کے نام اور طلسمی عبارتیں کندہ ہوتی تھیں، چنانچہ جو پتھر برآمد ہوا ہے، وہ اس قسم کا ہے، جسے "ابراساکس" (Abraxas) کہتے ہیں، اس نام کے اعداد (۳۶۵) ہیں جو سال کے دنوں کی تعداد ہے، اس پتھر پر ابراساکس نامی ایک عجیب جانور کی تصویر بنی ہوئی ہے، جس کا سر مرغ کا ہے، اور جس کی ٹانگوں کے بجائے دو سانپ ہیں،

ایتھنز کی قدیم عدالتی کارروائی سے متعلق بھی ایک دلچسپ چیز برآمد ہوئی ہے، جو شہری جیوری کے فرائض کے لائق سمجھے جاتے تھے، انھیں ایک کانسے کا ٹکٹ دیا جاتا تھا، جس پر اون کا نام، اوس شعبہ کا نام جس سے وہ متعلق ہوتے تھے، اور شہر کی مہر کندہ ہوتی تھی، مقدمہ کی سماعت کے وقت جیوری کے ہر رکن کو کانسے کے دو قرص دئے جاتے تھے، ایک کا مرکزی حصہ کھوکھلا اور دوسرے کا ٹھوس ہوتا تھا، جس قرص کا مرکزی حصہ کھوکھلا ہوتا تھا، اوسے ملزم کی بریت کے لئے ووٹ دینے میں استعمال کرتے تھے اور جس کا ٹھوس ہوتا تھا، اسے سزا کیلئے ووٹ دینے میں جیوری کا ہر رکن ووٹ دیتے وقت پوشیدہ طور پر ایک قرص کانسے کے ایک ٹب میں ڈال دیتا، اور پھر ان سب قرصوں کو جمع کر کے جیوری کی رائے معلوم کر لی جاتی، اور اسی کے مطابق مقدمہ کا فیصلہ کیا جاتا، جو قرص برآمد ہوئے ہیں، وہ چوتھی صدی قبل مسیح کے ہیں، اور یہ اسی زمانہ کے ہیں جس زمانہ کی عدالتی کارروائی کا بیان ارسطو نے اپنے "دستور ایتھنز" میں کیا ہے،

قدیم ایتھنز کے سیاسی قانون کے متعلق بھی ایک اہم چیز کا انکشاف ہوا ہے، پانچوین صدی قبل مسیح مین ایتھنز کے قانون مین جلاوطنی (Ostracism) کا رواج جگہ پاچکا تھا، اس قانون کے مطابق وہان کے شہری کسی قائد کو جو حد سے زیادہ قوت و اقتدار حاصل کرلے، دس سال کیلئے جلاوطن کرسکتے تھے، اس کا طریقہ یہ تھا، کہ اوس قائد کا نام مٹی کے ایک ٹکڑے پر جسے اوسٹراکون (Ostrakon) کہتے تھے کندہ کردیا جاتا تھا، اور وہی اس کے خلاف ووٹ کیلئے استعمال کیا جاتا تھا، پہلا مدبر جس کے خلاف یہ قانون جاری کیا گیا، ہپارکوس (Hipparchos) تھا، جو جنوری ۴۸۸ قبل مسیح مین جلاوطن کیا گیا، چنانچہ ایک اوسٹراکون جسپر اوس کے خلاف ووٹ دیا گیا تھا، گیارہ دوسرے اوسٹراکونون کے ساتھ برآمد ہوا ہے،

"ع ز"

خلفاے راشدین

سیر المہاجرین کا حصہ اول، یہ چارون خلفا کے ذاتی حالات فضائل اور مذہبی و سیاسی کارنامون اور فتوحات کا آئینہ ہے، حجم ۲۰۰ صفحے قیمت: ۔۔ عہ

مہاجرین

حصہ اول

اس کتاب مین خلفائے راشدین کے علاوہ بقیہ حضرات عشرہ مبشرہ اکابر بنی ہاشم و قریش اور ان اصحاب کے حالات سوانح، اخلاق و فضائل کی تفصیل کی گئی ہے، جو فتح مکہ سے پہلے اسلام لائے، شروع مین ایک مفصل مقدمہ مین قریش کی تاریخ اور قبائل مہاجرین کی تفصیل کی گئی ہے، اور مہاجرین کے مخصوص فضائل بیان کئے گئے ہین، لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ، قیمت للعہ حجم ۴۲۹ صفحے،

منیجر دار المصنفین

اخبارِ علمیہ

سائنس کی مختصر ترین تاریخ،

ڈاکٹر ہنری کرو، (امریکہ) نے سائنس کی ایک نہایت مختصر اور دلچسپ تاریخ لکھی ہے، جو حسب ذیل ہے،

فیثاغورث نے کُل کا نام "کائنات" (Cosmos) رکھا، اقلیدس نے جومیٹری کی تشکیل کی، ارشمیدس (Archimedes) نے طبیعیات کی،

زینوفانیس (Xenophanes) نے افلاک کو ایک دیکھا، کوپرنکس (Copernicus) نے اس کا مرکز آفتاب کو ٹھہرایا،

اجسام طبعی کی حرکت مین گیلیلیو (Galileo) نے ایک قانون کا مشاہدہ کیا، اور اوسی نیوٹن نے جاذبیت عامہ (Universal gravitation) کا اصول مرتب کیا،

دیمقراطیس (Democritus) نے ترکیب مادہ کے ذروی نظریہ (atomic Theory) کی ابتدا کی، ڈالٹن نے اس نظریہ کو مُستقل و مستحکم کردیا،

اُنیسوین صدی مین ڈارون (Darwin) اور لامارک (Lamarck) نے ارتقائے عضوی کے مسئلہ کو باقاعدہ شکل مین پیش کیا،

ٹیکہ کے ذریعہ سے امراض سے محفوظ رکھنے کا طریقہ جینر (Jenner) اور پاسچر (Pasteur) نے دریافت کیا،

اورسٹڈ (Oersted) اور فراڈے (Faraday) نے برقی مقناطیسیت کا نظریہ دریافت کیا، میکسول (Maxwell) اور ہرٹز (Hertz) نے اور ترقی دی، بیکرل (Becquerel) کیوری (Curies) اور ٹامسن (Thomson) کی کوششون سے نازک ذرات اور برقیہ (Fragile atoms & electrons) کا مشاہدہ کیا گیا، آئنسٹائن (Einstein) کے نظریہ نسبت نے سائنس کے ایک جدید باب کا افتتاح کیا ہے۔

جمہوریہ ترکی مین بچون کی نگہداشت

رسالہ مسلم ورلڈ اکتوبر ۱۹۳۳ء مین استنبول کے روزنامہ جمہوریہ (۱۰ر جنوری ۱۹۳۳ء) کا حسب ذیل اقتباس شائع ہوا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ دس سال کے عرصہ مین انجمن تحفظ اطفال ترکی نے غازی مصطفےٰ کمال پاشا کے زیر نگرانی ملک کے (۴۰۰) مرکزون مین ترکی بچون کی دیکھ بھال کی ہے:۔

اس انجمن نے (۱۱۰۰۴۳) بچون کو اپنی نگرانی مین لیا ہے، (۵۰۲۴۷) بچون کیلئے دودھ کا انتظام کیا ہے (۱۴۴۰۴۹) بچون کو جوتے تقسیم کئے ہین (۱۵۰۴۸۰) بچون کو ٹوپیان خریدی ہین اور (۱۴۴۲۰۳) بچون کیلئے مدرسہ کی ضروریات کا سامان فراہم کیا ہے (۱۴۹۱۴۷) بچون کا علاج ہوا ہے (۵۰۰۰) بچون کو دوائی مدد دی گئی ہے (۳۴۴۵۰۲) بچون کو طبی غسل دیا گیا ہے (۲۶۳) بچون کا ختنہ کیا گیا ہے (۱۵۱۲) بچون کی ولادت کے وقت دائیان موجود رکھی گئی ہین (۵۰۵۹۱) بچون کو مدرسون اور دوسرے ادارون مین داخل کیا گیا ہے، (۵۲۶۲۲) بچون کو دوسرے مختلف طریقون سے مدد دی گئی ہے، بچون کی مجموعی تعداد جنھون نے اس انجمن کے ذریعہ کسی طریقہ پر مدد پائی ہے (۶۰۰۵۸۰) ہے۔

قسطنطنیہ مین ابتدائی تعلیم کی ترقی

مسلم ورلڈ قسطنطنیہ مین ابتدائی تعلیم کے متعلق بھی جمہوریہ ۳ر جنوری ۱۹۳۳ء کا حسب ذیل اقتباس نقل کرتا ہے:

"قسطنطنیہ مین ابتدائی تعلیم کا نصاب پوری کامیابی کے ساتھ جاری ہے، جہان تک ابتدائی تعلیم کا تعلق ہے، قسطنطنیہ اس معیار تک پہنچ چکا ہے، جو تمام دوسرے شہرون کے لئے بھی ہونا چاہئے، پہلے ابتدائی مدارس مین بچون کی تعداد صرف تیس ہزار تھی، لیکن اب سخت کوششون کے باعث صرف ترکی مدارس مین یہ تعداد اٹھاون ہزار ہو گئی ہے اگر اس تعداد مین اُن بچون کا شمار بھی کر لیا جائے جو غیر ملکی مدارس مین تعلیم پا رہے ہین، تو اندازہ یہ ہے کہ ابتدائی مدارس کے طلبہ کی تعداد شہر قسطنطنیہ کی آبادی کی دس فیصدی ہو جائیگی، دستوری حکومت کے زمانہ مین ابتدائی مدارس کیلئے صرف پانچ عمارتین بنائی گئی تھین، لیکن جمہوری حکومت کے دور مین ایسی ۵۹ عمارتین تعمیر ہو گئی ہین، اور اب یہ بھی دیکھا جاتا ہے، کہ بہت سے غریب بچے صبح سے دوپہر تک یا دوپہر سے شام تک مدرسون مین پڑھتے ہین، اور باقی اوقات مین اپنی معاش حاصل کرنے کیلئے اخبارات فروخت کرتے ہین جن بچون کے لئے کوئی ٹھکانا نہین ہے، اُن کے لئے غلطہ مین میونسپلٹی کی طرف سے ایک جائے قیام کا انتظام کیا جائے گا، اور چند سال کے اندر قسطنطنیہ کے اُن تمام بچون کو جنکی عمر ابتدائی مدارس مین تعلیم پانیکی ہین، اور جو صبح سے شام تک دوکانون مین اپنا وقت صرف کرتے ہین، پولیس کے ذریعہ سے مدرسون مین جانے کیلئے مجبور کیا جائے گا،

قدیم مطبوعات کی قدردانی

اسٹیٹسمین مورخہ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۳۳ء مین سونے سے تولی جانے والی کتابین کے عنوان سے یورپ و امریکہ مین قدیم مطبوعہ کتابون کی قدردانی کے دلچسپ حالات شائع ہوئے ہین، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک ان مادہ پرست ممالک مین بھی سب سے قیمتی کتابین آسمانی کتابین ہی سمجھی جاتی ہین، اور اون کے بعد انگریزی ادب کے ممتاز شاعر شکسپیر کی تصنیفات آتی ہین چنانچہ اس وقت تک مطبوعہ کتابون مین سب سے قیمتی کتاب انجیل ہی کا ایک نسخہ ہے جسے گوٹن برگ نے شائع کیا تھا، یہ نسخہ آخری مرتبہ (۲۱۲۰۰) پونڈ مین فروخت ہوا ہے، اس کے بعد قیمت کے لحاظ سے دوسرا نمبر شکسپیر کی ایک نظم "وینس اینڈ ایڈونیس" (VENUS AND ADONIS) کا ہے، جو (۱۵۱۰۰) پونڈ مین فروخت ہوئی تھی، اور ابھی حال مین اسی شکسپیر ہی کے ڈرامون کا ایک نہایت قدیم نسخہ اپنی قیمت کے لحاظ سے دنیا کی مطبوعہ کتابون مین تیسرے نمبر پر آیا ہے، یہ نسخہ ۱۶۳۳ء کا چھپا ہوا ہے، اشاعت کے وقت اس کی قیمت محض ایک پونڈ تھی، مگر آج (۱۴۵۰۰) پونڈ مین فروخت ہوا ہے، یہ نسخہ لارڈ روزبری کے کتب خانہ مین

محفوظ تھا، اور یہان سے اب امریکہ لے جایا گیا، اور اول الذکر دونون کتابون کے خریدار بھی امریکی ہی ہین گوٹن برگ کی شائع کردہ ایک دوسری انجیل بھی ہے جو تین جلدون مین ہے، اور ان کی مجموعی قیمت (۱۱۷۰۰۰) پونڈ مل چکی ہے، ان جلدون کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ سب سے پہلی کتاب ہے، جو ٹائپ مین شائع ہوئی ہے اس کا زمانۂ طباعت آج سے (۴۷۰) سال پہلے ہے، اسکے ۱۲ مکمل نسخے اسوقت تک دنیا مین معلوم ہوسکے ہین، اسی طرح انجیل کا ایک دوسرا نسخہ جو پہلے کارڈینل منیزلرن کے پاس تھا (۸۷۰۰) پونڈ مین فروخت ہوا، پھر اسکی (۱۲۰۰۰) پونڈ قیمت ملی اہل یورپ مطبوعہ کتابون کے مصنفون کی دستی تحریرون کی بھی اوسی طرح قدردانی کرتے ہین انگریزی ادبیات کی شہرۂ آفاق نظم "الائس اِن ونڈرلینڈ" (ALICE IN WONDERLAND) کا وہ قلمی مسودہ جو شاعر کے ہاتھ کا ہے (۷۷۰۰۰) پونڈ مین فروخت ہوا، اور یہان تک کہ ڈاکٹر جانسن کے زبان انگریزی کے اوس لغت کے پروفون کی قیمت بھی ۲۲۵۰ پونڈ ملی، جو ۱۷۵۵ء مین شائع ہوا تھا، ان پروفون مین ڈاکٹر جانسن کے ہاتھ کی بہت سی ایسی اصلاحین درج ہین، جو شائع شدہ نسخہ مین درج نہ ہوسکین، نیز ان مین مصنف کے ہاتھ کے بہت سے اضافے بھی ہین، یہ پروف مکمل تین جلدون مین سمائے ہین، لیکن ان مین کتاب کا مکمل نسخہ موجود نہین ہے،

موسم کا اثر نشو ونما پر

ڈاکٹر ٹرنر (TURNER) نگران محکمۂ حفظان صحت مساچوسٹس (MASSACHUSETTS) (امریکہ) نے اپنے طویل تجربون کے بعد بچون کی نشو ونما کے متعلق ذیل کا بیان شائع کیا ہے:-

تندرست بچون کے جسم کے وزن بڑھنے کی رفتار اپریل، مئی اور جون کے مہینون مین سست پڑجاتی ہے، پھر ابتدائے موسم سرما سے وزن کے بڑھنے مین تیزی شروع ہوتی ہے یہانتک کہ موسم سرما اور خزان کے مہینون مین یہ پوری تیزی سے بڑھتا ہے، اوس کے برخلاف اس کے بچون کا قد زیادہ تیزی سے اونھین مہینون مین بڑھتا ہے جنمین وزن کی زیادتی سست رفتاری سے ہوتی ہے، لیکن یہ تعجب کے ساتھ سنا جائے گا کہ یہ دنیا کے شمالی نصف کرہ کے بچون کی نشو ونما کے حالات مین جنوبی نصف کرہ کے بچون کے وزن اور قد کے تیزی اور سستی کے ساتھ بڑھنے کا موسم شمالی نصف کرہ کے اس موسم کے بالکل برعکس ہوتا ہے،

(ع ز،)

ادبیات

خونِ جگر

از حضرت جگر مرادآبادی،

سنتا ہون کہ ہر حال مین وہ دل کے قرین ہے   جس حال مین ہون اب مجھے افسوس نہین ہے

عالم ہے کچھ ایسا کہ زمان ہے نہ زمین ہے   مین ہون، نہ دریا، نہ سجدہ، نہ جبین ہے

جس دل مین تری یاد ہے تو صدر نشین ہے   وہ دل بھی حسین اوس کی محبت بھی حسین ہے

زاہد مگر اس رمز سے آگاہ نہین ہے،   سجدہ وہی سجدہ ہے کہ جو ننگِ جبین ہے

جس رنگ مین دیکھو اوسے وہ پردہ نشین ہے   اور اس پہ یہ پردہ ہے کہ پردہ ہی نہین ہے

ہر ایک مکان مین کوئی اس طرح مکین ہے   پوچھو تو کہین بھی نہین، دیکھو تو یہین ہے

نزدیک ہو یا دور، جہان تم ہو وہین ہے   عاشق وہی عاشق ہے جو مجبور نہین ہے

وہ آئے ہین لے دل ترے کہنے کا یقین ہے   لیکن مین کرون کیا مجھے فرصت ہی نہین ہے

قطعاتِ امجد

از حکیم الشعرا، حضرت امجد حیدرآبادی،

آیا ہے، زمانۂ ترقی،   گندہ بندہ، خدا ہوا ہے،

ایمان سے دل کو صاف کرکے   امجد، صوفی بنا ہوا ہے،

جہان کو نازہے ہستی پر اپنی، مین اپنی نیستی پر مر رہا ہون،
ملا ہے جب سے لطفِ خاکساری، تنزل مین ترقی کر رہا ہون،

ہے اور یقینی ہے، یہی سب کی صدا ہے، لیکن، نہین معلوم کہ وہ کون ہے کیا ہے،
کیا کوئی کہے اوس کی حقیقت کہ وہ کیا ہے ہاتھ آئے تو بت، ہاتھ نہ آئے تو خدا ہے،

ہر گھڑی عمر کی کیا جلد گذر جاتی ہے، جس طرح کوئی اُڑا جاتا ہو طیارے مین
جان اور جسم کی آغوش مین کیا حیرت ہے زندگی جھولتی ہے موت کے گہوارے مین

رنگِ حسرت،

از جناب جمیل قدوائی ایم اے علی گڈھ،

میرے نالون پہ اوس نے آہ نہ کی، آہ کیا مجھ پہ اک نگاہ نہ کی،
مین نے کس شوق سے اوسے دیکھا اوس نے میری طرف نگاہ نہ کی،
غلط انداز بھی نگہ مجھ پر، تو نے اے شوخ کم نگاہ نہ کی،
میری آہون نے مجھ کو خاک کیا، اوس ستمگر کے دل مین راہ نہ کی،
ہم نے ہنس ہنس کے عشق مین کاٹی جان پر بھی بنی تو آہ نہ کی،
سچ ہے یہ آپ نے مجھے چاہا مین نے ہی آپ سے نباہ نہ کی،
تجھ کو دل دے کے وہ سبق سیکھا، بھول کر پھر کسی سے چاہ نہ کی،
ہم اسیرون نے جب قفس چھوڑا، مڑکے پھر اس طرف نگاہ نہ کی،
زندگی بھر ہم اس روش سے چلے کہ تمیز گدا و شاہ نہ کی،

دولتِ عشق پاکے مین نے جمیل
ہوسِ مال و حبِ جاہ نہ کی،

مطبوعاتِ جدیدہ

جدید اردو شاعری

از پروفیسر عبد القادر سروری ایم اے، کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، دکن حجم ۳۴۷ صفحے مجلد تقطیع چھوٹی، قیمت سے ر، ناشر انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ، حیدرآباد دکن،

ادھر چند سال مین اردو ادب اور شعر و شاعری کی تاریخ و تبصرہ پر بعض اچھی اچھی کتابین نکلی ہین، اون مین ایک اور اضافہ اس زیرِ تبصرہ کتاب "جدید اردو شاعری" سے ہوا ہے، جو غور و فکر اور اصابتِ رائے کے ساتھ لکھی گئی ہو، کتاب کا مبحث اس کے نام سے ظاہر ہے، مصنف نے اس مین دورِ جدید کی شاعری پر بامعان نظر بحث کی ہے، کتاب چند حصون اور ہر حصہ چند بابون مین تقسیم ہو، پہلے حصہ مین شعر کی ماہیت، تعریف، شاعری کی قسمین، اور پھر اردو شاعری کی صنفین بیان کی گئی ہین، دوسرا حصہ گویا اصل موضوع پر مقدمۂ کتاب کی حیثیت رکھتا ہو، جس مین مصنف نے جدید اردو شاعری کا آغاز انگریزی حکومت کے تسلط کے بعد سے دکھایا ہو، اور اوسے "دورِ انقلاب" سے تعبیر کرکے بتایا ہو، کہ اس سے پہلے اردو شاعری دورِ انحطاط مین تھی، پھر اس کے تنزل کے اسباب بتائے ہین اُسکے بعد انقلاب کے اثرات دکھا کر آزاد اور حالی کو جدید اردو شاعری کا معمار بتایا ہے، اور جدید اردو شاعری کی پیدائش کا زمانہ ۱۸۶۷ء سے ۱۸۸۴ء تک مین متعین کیا ہو، اس کے بعد کتاب کا تیسرا حصہ آتا ہے، اور یہین سے اصل موضوع بحث چھڑتا ہے، مصنف نے اس کو "عصرِ اصلاح" سے تعبیر کیا ہے، اس مین آزاد، حالی، نذیر احمد، شرر، شبلی، اور کیفی حیدرآبادی کو جگہ دی ہے، ان مین سے ہر ایک کے حالاتِ زندگی اس اسلوب مین لکھے ہین، جس سے ان کی شاعری کی تدریجی ترقی نمایان ہو، اور پھر ہر ایک کی شاعری کے کمالات و خدمات پر محققانہ تبصرہ کرکے باہم ایک دوسرے مین موازنہ کیا ہو، اور حقیقت یہ ہے کہ ان معاصرین پر یکجا قلم اوٹھانے کے باوجود ذاتی رجحانات و عصبیت سے دامن بچاکر جادۂ اعتدال پر قائم رہنے کی کوشش رکھنا مصنف کا لائقِ ستایش کارنامہ ہے، اس کے بعد درمیانی زمانہ

جس میں اسماعیل، اکبر، شوق قدوائی، اور نظم طباطبائی وغیرہ کا تذکرہ آیا ہے، پھر عصر حاضر آتا ہے، جس میں اس عہد کے ممتاز شعراء اقبال، سیماب، سرور جہان آبادی، حسرت، فانی، یگانہ، چکبست، عظمت، جوش، اصغر، امجد، جگر، ریاض، صفی، جلیل، عزیز، اور رسوا وغیرہ کا تذکرہ آیا ہے، اور اوسی اسلوب و انداز میں ان کی شاعری پر ناقدانہ تبصرہ ہے، آخری باب "شعرائے مستقبل" کے عنوان سے ہے جس میں ہمارے نوجوان شعرائے اردو کو روشناس کیا گیا ہے،

مصنف کی رایوں اور تنقیدوں سے یوں تمام و کمال اتفاق کرنا تو ممکن نہیں، لیکن کم از کم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ رائیں کامل غور و فکر اور کلام کے صحیح مطالعہ کے بعد قائم کی گئی ہیں، البتہ حیدرآباد کے شعرائے اردو کے متعلق مصنف کی رائیں شاید اصول جرح و تعدیل کی حیثیت سے بھی مستند نہ سمجھی جائیں، تاہم ان کے تذکروں میں بھی ایک حد تک اظہار حق کی کوشش کی گئی ہے، لیکن معلوم نہیں مصنف نے ہمارے شہر کے زندہ شاعر اقبال سہیل کو "سہیل مرحوم" کے لقب سے کیوں یاد کیا ہے، شاید یہ "تابش سہیل" کی آیندہ درخشانی کا تفاؤل یا پیش خیمہ ہو، جو کچھ دنوں میں پریس سے نکلنے والی ہے، اور اس کی مستحق تھی کہ اس کتاب کے باب عصر حاضر میں پہلے سے موجود ہوتی،

انقلاب دہلی، مرتبہ جناب نظامی بدایونی، نظامی پریس بدایون، حجم چھوٹی تقطیع کے ۱۲۰ صفحے، ورق خوشنما، قیمت عہ،

سنہ ۵۷ء کے ہنگامہ خیز انقلاب کے بعد ہندوستان کو جن سیاسی حالات سے دوچار ہونا پڑا، اون میں دیکھتے ہوئے اس عہد کے اردو شعراء کے کلام میں دہلی اور اسلامی ہند کی بربادی پر جو کچھ بھی مل جاتا ہے، وہ بسا غنیمت ہے، کیونکہ مختلف سیاسی ماحول کی بنا پر اوس عہد کے شعرائے اردو نے اگر اپنے مجروح جذبات و احساسات کو ظاہر کرنے کی جرأت بھی کی تو اوسی گل و بلبل اور روداد چمن کی داستان کا پردہ ڈال کر، تاہم یہ بھی صحیح نہیں کہ اردو شاعری دہلی اور اسلامی ہند کی بربادی کے مرثیوں سے کلیتہً خالی ہے، جناب نظامی بدایونی کا جنھوں نے دہلی کی بربادی کے ستائے ہوؤں کی پرنم آنکھیں بھی دیکھی ہوں گی، شکر گذار ہونا چاہئے کہ اونھوں نے اس جانب توجہ کی، اور دہلی کی بربادی کے اردو مرثیے ایک رسالہ کی شکل میں جمع کر دئے، جو فریاد دہلی معروف بہ انقلاب دہلی کے نام سے موسوم ہے، اس میں تقریباً ۵۰، ۶۰ اردو شعراء کے مرثیے ہیں، رسالہ کی ترتیب شعراء کے ناموں کے حروف تہجی پر ہے، ایک ایک دو دو سطروں میں شاعروں کا مختصر تعارف بھی درج ہے، ابتدا میں

خواجہ حسن نظامی صاحب مولف "غدر دہلی کے افسانے" نے ایک دیباچہ لکھا ہے،

تہذیب عمل، از جناب ملک محمد باقر نسیم رضوانی متعلم ایم اے، ناشر مہتمم دفتر تذکرہ گجرات پرنٹنگ پریس گجرات پنجاب، حجم ۹۰ صفحے، قیمت ۶؍

ملک محمد باقر صاحب نسیم رضوانی پنجاب کے ایک لائق اور ہونہار نوجوان ہیں اور دور طالب علمی سے مسائل حیات و دنیا پر غور و فکر کی نظر رکھنے کی عادت ڈالی ہے، زیر تبصرہ رسالہ تہذیب عمل ان کی تعلیمی و علمی زندگی کا پہلا ثمرہ ہے، اسمیں اونھوں نے اپنے ہمعمر نوجوانوں کو اپنی عملی زندگی کو کامیاب بنانے اور صحیح اصول زندگی اور اچھے عادات اختیار کرنے کیلئے راہ ہدایت دکھائی ہے، رسالہ میں کوشش کی گئی ہے کہ ایک ایک مسئلہ یا اصول زندگی کو ایک ایک صفحہ میں پیش کیا جائے، اور جہاں ضرورت ہوئی ہے، اوسی سابق موضوع کو نئے صفحہ پر نئے عنوان سے جگہ دی گئی ہے تقریباً ۸۰ عنوانات ہیں، رسالہ اپنے موضوع کے لحاظ سے دلچسپ اور ہمارے نوجوان طبقہ کے مطالعہ کے لائق ہے،

فرانسیسی افسانے، از جناب عزیز احمد صاحب طالب علم جامعہ عثمانیہ، ناشر مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن، حجم چھوٹی تقطیع کے ۲۰۰ صفحے، قیمت ۱۲؍

مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد کی جانب سے جناب عبدالقادر صاحب سروری کی ادارت میں "دنیا کے شاہکار افسانے" کی اشاعت کا جو سلسلہ جاری ہے، اوس کا چوتھا حصہ فرانسیسی افسانے کے نام سے شائع ہوا ہے، اس میں ۹، ۱۰ مختصر فرانسیسی افسانوں کا ترجمہ ہے، دیباچہ میں فرانسیسی ادب پر سرسری تبصرہ کیا گیا ہے اور ہر افسانے کے ساتھ اوس کے فرانسیسی افسانہ نگار کی تصویر اور اوس کا مختصر تعارف درج ہے،

تاج آفرینش، از جناب عبدالمجید صاحب نعمانی، حجم ۷۰ صفحے، قیمت ۸؍، رشید اجمل بکڈپو پریس بلڈنگ بمبئی نمبر ۹،

"تاج آفرینش" مصر کی ایک مصلح خاتون ملک خانم عرف باحثۃ البادیہ کے چند مضامین کا اردو ترجمہ ہے، مضامین میں پردہ، تعدد ازدواج، معاشرت زن و شو، اور عورتوں کی سسرال کی زندگی وغیرہ کے مباحث ہیں، مضامین خصوصاً عورتوں کے پڑھنے کے لائق ہیں، ترجمہ صاف، سلیس اور رواں ہے،

پردہ اسلامی نقطہ نگاہ سے، از مولوی سید محمد ادریس صاحب تحصیلدار (پنشنر)، تاج گنج آگرہ، قیمت ۱؍

اس رسالہ مین مکالمہ کے طور پر اسلامی پردہ، اور عورتون کی اسلامی معاشرت کو بیان کیا گیا ہے،

گلدستہ صد احادیث نبوی از مرتبہ مولینا احمد علی انجمن خدام الدین شیرانوالہ دروازہ لاہور خوبصورت مجلد چھوٹی تقطیع کے ۲۸ صفحے،

لاہور کی انجمن خدام الدین مفید دینی خدمت انجام دے رہی ہے، اس کی جانب سے تبلیغ و اشاعت اسلام اور اصلاح مسلمین کیلئے رسالے شائع ہوتے رہتے ہین، جو مفت یا برائے نام قیمت پر ملتے ہین، زیر نظر رسالہ گلدستہ صد احادیث نبوی، مین صحاح سے سو مفید حدیثین مع ترجمہ کے ایک خوبصورت رسالہ کی شکل مین چھاپی گئی ہین، یہ رسالہ بلا جلد کے مفت اور مجلد ۲ کے ٹکٹ بھیجکر انجمن سے مل سکتا ہے،

مشکوٰۃ الصلوات مؤلفہ مولوی محمد الیاس صاحب برنی، استاذ معاشیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن،

حجم ۴۸ صفحے تقطیع چھوٹی قیمت ۸ مؤلف سے بیت السلام حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے،

مشکوٰۃ الصلوات کا تذکرہ چند سال پہلے ان صفحات مین آچکا ہے، اس مین درود و سلام کی ۶ حزبین فی روز وظیفہ کیلئے مرتب کیگئی ہین رسالہ مقبول ہوا اب اسی کا طبع ثانی دوبارہ شائع ہوا ہے،

اسلامی عقائد از مولینا اسلم جیراجپوری شائع کردہ مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی قیمت ۱۰

بچون کیلئے دینیات کی تیسری کتاب کے عنوان سے یہ رسالہ لکھا گیا ہے، رسالہ کا نام "عقائد اسلامی" ہے، لیکن مباحث مین انبیائے کرام کے تاریخی حالات کا حصہ زیادہ ہے،

کتبخانہ بانکی پور کی نئی فہرستین مشرقی کتبخانہ بانکی پور کی ترتیب فہرست کا جو کام کئی سال سے جاری تھا افسوس ہے کہ وہ حکومت بہار کی مالی دشواریون کے سبب سے بند ہو گیا تھا، تاہم فہرست مذکور کی جو جلدین مطبع مین زیر طبع تھین، ان کی چھپائی جاری ہے، چنانچہ اوس کی حسب ذیل جلدین نئی چھپ کر شائع ہوئی ہین،

۱- جلد انیس حصہ اول عربی مخطوطات متعلقہ اصول فقہ و فقہ مرتبہ مولوی عبد الحمید صاحب مطبوعہ بہار گورنمنٹ پریس پٹنہ ۱۹۳۱ء

۲- جلد بائیس حصہ دوم عربی مخطوطات متعلقہ علوم القرآن مرتبہ مولوی حاجی معین الدین صاحب ندوی مطبوعہ مطبع مذکور ۱۹۳۲ء

۳- ضمیمہ فہرست مخطوطات فارسی جلد اول مرتبہ خان بہادر مولوی عبد المقتدر صاحب مطبوعہ مطبع مذکور ۱۹۳۲ء

۴- ضمیمہ فہرست مخطوطات فارسی، جلد دوم مرتبہ خان بہادر موصوف مطبوعہ مطبع مذکور ۱۹۳۳ء

" ر

دار المصنفین کی ادبی کتابین

شعر الہند حصہ اول، جسمین قدما کے دور سے لیکر دور جدید تک اردو شاعری کے تاریخی تغیرات و انقلابات کی تفصیل کیگئی ہے، اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ و مقابلہ کیا گیا ہے، کاغذ اور لکھائی چھپائی اعلیٰ مطبوعہ معارف پریس ضخامت ۵۰۴ صفحے قیمت للعہ

حصہ دوم، جسمین اردو شاعری کے تمام اصناف یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے، کاغذ اور کتابت عمدہ، ضخامت ۴۵۰ صفحے، قیمت للعہ

گل رعنا، اردو زبان کی ابتدائی تاریخ، اور اسکی شاعری کا آغاز، اور عہد بعہد کے اردو شعراء کے صحیح حالات اور انکے منتخب اشعار، اردو مین شعراء کا یہ پہلا مکمل تذکرہ ہے، جسمین آب حیات کی غلطیون کا ازالہ کیا گیا ہے، ولی سے لیکر حالی و اکبر تک کے حالات، ضخامت ۵۰۴ صفحے، قیمت عہ از مولنا سید عبد الحی صاحب مرحوم

مکاتیب شبلی، مولنا شبلی مرحوم کے دوستون، عزیزون، شاگردون کے نام خطوط کا مجموعہ، جسمین مولنا کے قومی خیالات اور علمی، تعلیمی اور ادبی مباحث ہین، یہ درحقیقت مسلمانون کی تیس برس کی تاریخ ہے، طبع دوم، قیمت جلد اول ۱۲ جلد دوم ۱۲ ضخامت حصہ اول ۳۰۶ صفحے دوم ۲۶۱ صفحے،

موازنہ انیس و دبیر، اردو کے مشہور باکمال شعراء میر انیس کی شاعری پر ریویو، اردو مین فصاحت و بلاغت کے اصول کی تشریح، مرثیہ کی تاریخ، میر انیس کے بہترین مرثیون کا انتخاب، اور مرزا دبیر سے ان کا موازنہ، اردو مین اپنے فن مین یہ پہلی کتاب ہے، ضخامت ۲۸۴ صفحے قیمت سے، ر سیبر،

کلیات شبلی اردو، مولانا کی تمام اردو نظمون کا مجموعہ جس مین مثنوی صبح امید، قصائد جو مختلف مجلسون مین پڑھے گئے اور وہ تمام اخلاقی، سیاسی، مذہبی، اور تاریخی نظمین، جو کانپور، ترکی، طرابلس بلقان، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی وغیرہ کے متعلق لکھی گئی ہین، یکجا ہین، یہ نظمین درحقیقت مسلمانون کے پچھلے سالہ جد و جہد کی ایک مکمل تاریخ ہے، لکھائی چھپائی کاغذ اعلیٰ، ضخامت ۱۳۰ صفحے، قیمت عہ

افادات مہدی، ملک کے نامور انشا پرداز ایم مہدی حسن مرحوم افادی الاقتصادی کے ۳۰ مضامین کا مجموعہ مع مقدمہ و ضمیمہ جات، مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈہ، لکھائی چھپائی عمدہ، قیمت ہے، حجم ۳۰۵ صفحے،

سرگذشت ادب ترکی، جسمین ترکی ادب کی مختصر اجمالی تاریخ دلچسپ انداز مین بیان کیگئی ہے، ۲ کے ٹکٹ بھیجکر طلب کرین،